مقالہ نمبر۳

تعلیم وتدریس پراجرت لینے کی تحقیق

تعلیم وتدریس پراجرت وتنخواہ کا لینا اجروثواب کے منافی ہے یا نہیں؟ حیاۃ الصحابہ کے ایک اثر کی تحقیق

جناب مولانا محمد سعد صاحب کی بعض قابل اشکال باتوں کی تحقیق

مرتب

محمد زید مظاہری ندوی استاذ حدیث وفقہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمین والصلاة والسلام علی سید المرسلین

محمد وعلیٰ آله واصحابه اجمعین

مقالہ نمبر۳

تعلیم وتدریس پر اجرت وتنخواہ کا لینا اجر وثواب کے منافی ہے یا نہیں؟

منجملہ ان باتوں کے جن کو مولانا محمد سعد صاحب اور دیگر پرانے اصحابِ تبلیغ بیان کرتے رہتے ہیں اور ان کے بیان کی وجہ سے تبلیغ والوں میں کثرت سے یہ بات چل پڑی ہے اور وہ اپنے دل ودماغ میں یہ سمجھے ہوئے ہیں، اور زبانوں سے بکثرت اس کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں کہ:

دینی تعلیم وتدریس پر تنخواہ لینا اجر وثواب کے منافی ہے، اور یہ مقولہ زبان زد رہتا ہے کہ اجر لے لو یا اجرت لے لو، اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے اور **مَا أسئلکم علیه من أجر إن أجری إلا علی رب العالمین**، بطور دلیل کے پڑھتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد نے متفقہ رائے سے جو تحریر شائع کی اور جس پر دارالعلوم دیوبند اور دارالافتاء کی مہر بھی ثبت ہے اس میں مولانا کی جن قابل اعتراض اور قابل اصلاح باتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے:

''اجرت لے کر دین کی تعلیم دینا دین کو بیچنا ہے، زنا کار لوگ تعلیم قرآن پر اجرت لینے والوں سے پہلے جنت میں جائیں گے''

دستخط اکابر علمائے دیوبند ومہر دارالعلوم دیوبند

(ماخوذ از سعادت نامہ ص۶)

اور اسی سیاق میں بطور دلیل کے مولانا سعد صاحب حضرت عمرؓ کا وہ اثر بھی بیان کرتے ہیں جس کو حیاۃ الصحابہ ص ۳۳۳، ج ۳، میں نقل کیا گیا ہے، **یا أھل العلم والقرآن! لا تأخذوا للعلم والقرآن ثمناً فتسبقکم الزناة إلی الجنة.** (حیاۃ الصحابہ ص۳۳۳، ج۳) اس اثر کی تحقیق آگے آرہی ہے۔

اسی کے پیشِ نظر مولانا سعد صاحب نے اپنی بعض تقریروں میں معلّمین واساتذۂ مدارس کی تنخواہ کو اجرتِ زانیہ تک سے تشبیہ دی ہے، چنانچہ ایک موقع پر مظاہر علوم سہارنپور میں ایک مجلس میں مولانا سعد صاحب دامت برکاتہم نے یہی موضوع چھیڑ دیا، اور تعلیم وتدریس پر تنخواہ لینے کی مذمت وقباحت بیان کرتے ہوئے حضرت عمرؓ کا یہی اثر پیش کیا، مجلس میں موجود اصحابِ علم واصحابِ افتاء نے مولانا کی بات کو غلط سمجھا، اور سخت اشکال کیا، اور اس کی تردید میں حضرت مولانا مفتی شعیب احمد صاحب بستوی (مفتی مظاہر علوم سہارنپور) نے ایک مضمون لکھا، جو حضرت مولانا محمد سلمان صاحب کی نظر ثانی کے بعد مظاہر علوم سہارنپور سے نکلنے والے ماہانہ رسالہ ستمبر ۲۰۰۴ء میں شائع کیا گیا، جس کی تفصیل آگے مقالہ کے اخیر میں آرہی ہے۔

الغرض مختلف انداز سے مختلف موقعوں میں مولانا سعد صاحب اور دیگر اکابر تبلیغ یہ مضمون کثرت سے بیان کرتے ہیں کہ اساتذۂ مدارس کو تنخواہ لئے بغیر پڑھانا چاہئے، تنخواہ لے کر پڑھانے سے اجر وثواب نہیں ملتا اور نہ ہی یہ دینی خدمت ہے، دینی خدمت اور تبلیغ تو وہ ہے جو بغیر اجرت کے ہو، **ما أسئلکم علیه من أجر** کے تحت فرماتے ہیں کہ اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے، اس نوع کے بیانات سے عوام الناس میں اہل مدارس اور اساتذۂ حدیث واصحاب افتاء اور دیگر معلّمین وملازمین کی طرف سے یہ بدگمانی بہت عام ہوگئی ہے کہ ہم تو جماعت میں نکل کر دین کی خدمت کرتے اور اپنے ایمان کو مضبوط کرتے ہیں اور یہ اہل مدارس مدرسوں میں پڑھاتے ہیں اور اجرت یعنی تنخواہ لیتے ہیں، اسی سے ان کا معاش وابستہ ہے، اس لئے یہ دینی خدمت نہیں ہے، اور نہ ہی ان کو ثواب ملے گا، کیونکہ یہ تو ان کا معاشی سلسلہ ہے، جیسے ہم سرکاری ملازم ہیں، اور چھٹی

لے کر اللہ کے راستہ میں نکلتے ہیں اور دینی خدمت کرتے ہیں، اسی طرح اصحاب مدارس کو بھی چھٹی لے کر بغیر عوض واجرت کے فی سبیل اللہ خدمت کرنا چاہئے، مدرسوں میں اگر پڑھا رہے ہیں، اگر تنخواہ لئے بغیر پڑھائیں تب تو یہ دینی خدمت اور اجر وثواب کا ذریعہ ہوسکتا ہے، ورنہ تنخواہ لے کر پڑھانے سے اجر وثواب کا استحقاق نہیں رہتا اور نہ ہی یہ دینی خدمت ہے، کیونکہ اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے۔

یہ فکر اور یہ ذہن ہزاروں لاکھوں اصحاب تبلیغ کا اس نوع کے بیانات کو سن کر بن چکا ہے، اور اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے مولانا سعد صاحب اور دوسرے اکابر تبلیغ کے اس نوع کے بیانات سے، اللہم احفظنا۔

سنبھل اجتماع کے موقع پر مولانا محمد سعد صاحب کے بیان کا اقتباس

عالم کے لئے جامعیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تعلیم وتبلیغ اور تجارت، تینوں کو جمع کرے ورنہ نکمّا پن ہے

گذشتہ سال ۲۰۱۶ء میں سنبھل میں ہونے والے اجتماع میں خواص وعلماء کے طبقہ میں مولانا محمد سعد صاحب کا بیان ہوا اس میں بھی مولانا نے واضح طور پر بیان فرمایا کہ:

علماء کو تین کام کرنے چاہئے، دعوت، تعلیم، تجارت، اجرت اور تنخواہ لے کر پڑھانے کو ناجائز قرار نہیں دیا، لیکن زور اسی پر دیا کہ معاش کے لئے تجارت کرو اور بغیر تنخواہ کے پڑھاؤ، علماء کو اپنے اندر جامعیت پیدا کرنے پر زور دیا، اور جامعیت کی تشریح یہ بیان فرمائی کہ علماء تین کام کریں، دعوت، تعلیم، تجارت، اور یہاں تک فرمایا کہ میرے نزدیک نکما پن ہے اس عالم کے اندر جس کے اندر جامعیت کی شان نہ پائی جائے، اس لئے اپنے اندر جامعیت پیدا کرو، یعنی دعوت، تعلیم اور تجارت تینوں کو جمع کرو، مولانا کی تقریر کا اقتباس انہی کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

’’عالم کے اندر جامعیت کا پیدا نہ ہونا یہ بڑے نکمے پن کی بات ہے، جامعیت پیدا کرو، جامعیت ہوگی تو دین کے ہر شعبہ کو فائدہ ہوگا، جامعیت نہیں ہے تو یہ ایک کام کا ہو کر رہ جائے گا، اس لئے میں عرض کرتا ہوں جو سال سے فارغ ہو کر جاتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ دیکھو تین کام جمع کرنا، تعلیم، دعوت اور کسب تجارت، تاکہ کسب سے دو کام کرو، ایک تو مستغنی ہو کر معلم بنو، مستغنی ہو کر معلم بنو، ایک بات، اور دوسرے اللہ کے راستے میں خرچ کرو خروج پر، اور امت کو دین کی تعلیم دو، جو تمہارے پاس اصل سرمایہ ہے۔

صحابہ کرام کی یہ خاص بات تھی کہ وہ تینوں چیزوں کو جمع کرتے تھے، دعوت، تعلیم اور کسب، صحابہ ان کو جمع کرتے تھے، ہمارا بھی کام یہ ہے کہ ہم ان تین چیزوں کو جمع کریں، تعلیم، کسب اور دعوت، ان تین چیزوں کو جمع کرنا، حضرت نے حیاۃ الصحابہ میں باقاعدہ باب قائم کیا ہے کہ صحابہ ان تین چیزوں کو کیسے جمع کرتے تھے؟ اور رہا اگر ضرورت ہے تو اس کی شریعت میں پوری گنجائش ہے کہ آپ راتب (تنخواہ) لیں، انتہیٰ بلفظہٖ۔

دوسرے موقع میں بیان فرماتے ہیں:

’’سب سے اہم یہ ہے کہ فارغ ہونے والے طلباء تینوں کام، دعوت، تعلیم اور تجارت ایک ساتھ کریں‘‘ (تحفۂ علم ودعوت ص ۵۷)

الغرض مولانا اہلِ علم اور معلمین کے لئے بغیر تنخواہ کے پڑھانے اور معاش کے لئے تجارت کرنے پر زور دیتے ہیں۔

اورنگ آباد کے اجتماع میں علماء کے مجمع میں مولانا کے بیان کا ایک اقتباس

ابھی چند ماقبل اورنگ آباد کے اجتماع (مورخہ ۲۴/۲۵/۲۶ رفروری ۲۰۱۸ء) میں علماء کے مجمع میں خطاب عام کے ساتھ مولانا نے بیان فرمایا:

’’میں سال لگانے والے علماء کو بہت تاکید کرتا ہوں واپس جانے کے وقت کہ پوری کوشش کرنا اس بات کی، اس چکر میں نہ رہنا کہ کوئی معقول تنخواہ ملے تو پڑھاؤ اس لئے کہ جب علم کو عمل تک پہنچانا سبب پر موقوف ہو جائے گا تو علم امت کے اس طبقہ تک محدود ہو جائے گا جن کے پاس سیکھنے یا سکھانے کے اسباب موجود ہوں، اس امت کے علماء کو علم امانت کے طور پر دیا گیا تھا اور یہ مزاج بنایا گیا تھا کہ کبھی علم کو بیچنا مت، کبھی علم کو بیچنا

مت، اس کا مزاج بنایا گیا تھا۔

ابی ان کعبؓ نے ایک بچہ کو قرآن سکھلایا اس کے باپ نے خوش ہو کر ہدیہ کے طور پر ایک کمان دے دی، کمان جہاد کا ایک آلہ ہے، ہم اللہ کا راستہ صرف خروج کو نہیں کہتے، ہم یہ کہتے ہیں ایک بچہ کو قرآن پڑھانا یہ بھی اللہ کا راستہ ہے، اس نے خوش ہو کر کمان ہدیہ میں دے دی، جس میں معاملہ نہیں ہوا تھا یہ اس کمان کو لے کر حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے حضورﷺ نے فرمایا اتنی لچکدار کمان کہاں سے لی، عرض کیا میں نے فلاں کے بچہ کو قرآن پڑھایا تھا اس نے خوش ہو کر ہدیہ میں دی، آپ نے فرمایا کہ جہنم کے ایک ٹکڑے کا یہ قلادہ ہے۔ (حیاۃ الصحابہ ص۲۵۴، ج۳)

میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کمان دنیاوی اعتبار سے کسی کام کی نہیں، صرف اللہ کے راستہ میں قتال میں تیر چلانے کے کام آئے گی۔

اسی طرح ایک صحابی نے سوال کیا یا رسول اللہﷺ ایک شخص اللہ کے راستہ میں نکلتا ہے اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے اور اس کے دین کو پھیلانے کے لئے اور نکلنے کے زمانہ میں اس نے ایک تیر کا ارادہ کر لیا ہے کہ تیر بھی ملے حالانکہ تیر آلۂ قتال میں سے ہے، اور تیر چلانے کے فضائل آپ حضرات نے پڑھے ہوئے احادیث میں، کہ اللہ کے راستہ میں تیر چلانے کا کتنا اجر ہے.....آپ نے جواب دیا کہ اس شخص کے لئے دنیا وآخرت میں اس تیر کے سوا اور کچھ نہیں''

نوٹ: یہ مقالہ تقریباً آٹھ ماہ قبل کا لکھا ہوا ہے، اورنگ آباد کے اجتماع میں ہونے والی مولانا محمد سعد صاحب کی تقریر کا یہ اقتباس بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔

مولانا محمد سعد صاحب کا یہ کہنا کہ امت کا مزاج بنایا گیا تھا کہ کبھی علم کو بیچنا مت، پھر اسی سیاق میں حضرت ابی ابن کعبؓ وغیرہ کے قصہ کو بیان کرنا جس میں تعلیم کی وجہ سے معلم کو دیئے گئے ہدیئے کو بھی عذاب کا ٹکڑا کہا گیا، مولانا کے اس نوع کے بیانات سے سامعین کا ذہن یہی بنتا ہے، خواہ وہ عوام ہوں یا سال لگانے والے علماء، کہ دینی تعلیم وتدریس پر اجرت وعوض اور وظیفہ وتنخواہ لینا خطرناک چیز ہے، دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہے، کیونکہ جس سیاق میں یہ حدیثیں اور دلیلیں بیان کی جاتی ہیں یقینی طور پر ان سے ذہن یہی بنتا ہے کہ تعلیم قرآن وتعلیم دین پر تنخواہ لینا صحیح نہیں، اور اجرت وتنخواہ کے ساتھ تعلیمِ دین کوئی دینی خدمت نہیں، اس کے نتیجہ میں یقینی طور پر علماء سے بدگمانی اور دوری پیدا ہوتی ہے اور یہ خیال بھی مسلط ہو جاتا ہے کہ تنخواہ دار اساتذہ ومدرّسین تو کوئی دینی خدمت نہیں کر رہے، تنخواہ لینے کی وجہ سے سب مستحقِ نار ہیں، دینی خدمت تو ہم کر رہے ہیں جو بغیر کسی تنخواہ وظیفہ کے دعوتِ الی اللہ کا کام کر رہے ہیں، چنانچہ مولانا کے انہی بیانات کے نتیجہ میں لاکھوں لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی اور بدگمانی سے نوبت بدزبانی تک آ گئی، جس کے نمونے آئے دن سامنے آتے رہتے ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو!

مدرّسین مدرسہ میں پڑھانے کو بھی دین کا کام سمجھ رہے ہیں، یہ بھی بڑا دھوکہ ہے

اورنگ آباد ہی کا واقعہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کے بعض ذمہ دار اور امیر صاحب نے یہ مضمون بیان فرمایا اور اپنے بڑوں سے سن کر ہی فرمایا، پھر وہ بات چل پڑی اور کثرت سے لوگ اس کو بیان کرنے لگے، وہ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''حضرت ابو ہریرۃؓ مفتی اعظم ہیں، مدینہ پاک میں دس مفتی تھے، وہ سب مفتیوں کے صدر تھے، وہ فرماتے ہیں اگر ایک مرتبہ بھی تقاضے میں نہیں گئے، زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، ایمان کے لالے پڑ جائیں گے۔

ہر آدمی اپنے اپنے شعبہ میں سمجھ رہا ہے کہ میں بھی دین کا کام کر رہا ہوں، ابھی علماء میں بات کر رہے تھے مولانا سعد صاحب تو ایک آدمی نے کھڑے ہو کر یہ کہا کہ ہم مدرسہ میں پڑھاتے ہیں دین کا کام کرتے ہیں، حضرت جی (مولانا سعد صاحب) نے فرمایا بغیر اجرت کے پڑھاتے ہو؟ کہا کہ نہیں، فرمایا اجرت لے کر پڑھانے کو دین کہتے ہیں؟ اجرت لے کر پڑھاتے ہو یہ بھی دین کا کام ہے؟ دین الگ شعبہ ہے، ایک سال تم کو بھی لگانا پڑے گا، ایک سال علماء کا ہے۔

بعض لوگ مدرسہ میں پڑھانے کو بھی دین کا کام سمجھ رہے ہیں، یہ بھی بڑا دھوکہ ہے، وہ اپنی ضرورت کے لئے پڑھا رہے ہیں، اپنی ضرورت پوری ہورہی ہے، بچوں کی ضرورتیں ہیں، شادی کا مسئلہ ہے، گھر کا مسئلہ، اپنی ضرورتوں کا پورا کرنا یہ شریعت ہے، اس کو دین کا کام سمجھنا دھوکہ ہے، یہ سمجھنا کہ میں بھی دین کا کام کررہاہوں، یہ دھوکہ ہے، کوئی آدمی نماز پڑھ رہاہے تو سمجھ رہاہے میں دیندار ہوں، کسی آدمی نے مسجد بنالی سمجھتا ہے میں دیندار ہوں، مسجد تو ایسا آدمی بھی بنادے گا جو کبھی مسجد نہیں آتا، کیا ایسے لوگوں نے مسجد نہیں بنائی جو کبھی مسجد نہیں آتے، کیا ایسے لوگوں نے لاکھوں روپئے مدرسے میں نہیں دیئے، جو کبھی مدرسے میں نہیں آتے، بہت سے ہندو دان کرتے ہیں، مسجد میں دیتے ہیں، لیکن ان کے پاس دین نہیں''

تبلیغ کے ایک بڑے ذمہ دار اور علاقہ کے امیر صاحب نے یہ بیان فرمایا۔

آئندہ سطور میں ہم اس کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں، اور اصحابِ تبلیغ کی یہ غلط فہمی اور بدگمانی بھی دور کرنا چاہتے ہیں جو اس نوع کے بیانات سے لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے، اور زبانوں پر بھی آتی رہتی ہے کہ چونکہ تنخواہ لینے سے ثواب کا استحقاق نہیں رہتا، اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے، لہٰذا علماء کو اپنے اندر اس نوع کی جامعیت پیدا کرنا چاہئے کہ دعوت اور تعلیم کے ساتھ وہ تجارت بھی کریں، ورنہ ان کے اندر یہ نکما پن شمار کیا جائے گا، اور تنخواہ لے کر پڑھانے والے دین کی خدمت نہیں کررہے ہیں اور نہ ہی وہ اجر وثواب کے مستحق ہیں، پیش نظر مقالہ کا موضوع دلائل کی روشنی میں اسی علمی غلطی اور بدگمانی کو دور کرنا ہے۔

علماء کے لئے جامعیت کا مفہوم

واقعہ یہ ہے کہ مولانا اور دیگر اکابر تبلیغ کی اگر یہ باتیں تسلیم کرلی جائیں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے تمام اکابر حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور دیگر اکابر علماء دیوبند وسہارنپور نے دین کی خدمت صحیح معنیٰ میں نہیں کی، کیونکہ یہ سب تنخواہ لیتے تھے، وہ تعلیم وتدریس کے ثواب کے بھی مستحق نہیں ہوں گے کیونکہ اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے، اور ہمارے یہ اکابر زندگی بھر نکمے ہی رہے کیونکہ اپنے اندر وہ یہ جامعیت نہیں پیدا کرسکے کہ تعلیم وتدریس کے ساتھ تجارت بھی کرتے۔

سوال یہ ہے کہ اہلِ علم کے لئے جامعیت اور نکمے پن کا یہ مفہوم اور یہ معیار خود مولانا محمد سعد صاحب کا اپنا اجتہاد ہے جس میں وہ منفرد ہیں، یا اس سے پہلے بھی کسی نے بیان کیا ہے؟ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تو اہلِ علم کے لئے جامعیت کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ علم وعمل اور اخلاص تینوں کے جامع ہوں جس کا ماخذ حدیث: ''النّاس کلھم ھالکون إلا العالمون الخ'' ہے یعنی صرف تعلیم پر اکتفاء نہ ہو بلکہ تعلیم کے ساتھ تزکیہ کا بھی اہتمام ہو، اور ان کا علم وعمل قال وحال ظاہر وباطن سب شریعت وسنت کے مطابق ہو، جامعیت کا یہ مفہوم ہمارے اکابر خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے مختلف انداز سے مختلف موقعوں میں بیان فرمایا ہے کہ جامعیت علم وعمل اور اخلاص کا نام ہے، لیکن محترم مولانا سعد صاحب کا اجتہاد اکابر کی تصریح کے خلاف یہ ہے کہ جامعیت یہ ہے کہ تعلیم وتبلیغ اور تجارت تینوں کام کرے ورنہ نکما پن ہے، عالم دین کو چاہئے کہ تعلیم وتدریس تو بغیر تنخواہ کے کرے، اور معاش کے لئے تعلیم وتدریس کے ساتھ تجارت بھی کرے۔

اس سلسلہ میں ہم اولاً کتاب وسنت کی چند نصوص پیش کریں گے، جن سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تنخواہ لے کر دینی تعلیم وتدریس کرنا اجر وثواب کے منافی نہیں، تنخواہ لے کر پڑھانے والے بھی دین کی خدمت کرنے والے اور فی سبیل اللہ کا مصداق، اور اللہ کے راستہ میں جہاد کا ثواب پانے والے ہیں، اگرچہ ان کا معاش اسی تنخواہ سے وابستہ ہو، دینی تعلیم پر معاش سے یہ وابستگی حدیث پاک کی روشنی میں خیر المعاش کا مصداق ہے، جو اثر وثواب کے ہرگز منافی نہیں۔

اس کے بعد ہم بعض خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کا نمونہ پیش کریں گے جس سے معلوم ہوگا کہ دینی خدمات پر وظیفہ اور تنخواہ لینے کی بابت خلفاء راشدین اور دیگر حضرات صحابہ کا کیا معمول رہا، نیز حضراتِ فقہاء اسلام اور ہمارے اکابر علماء دیوبند وسہارنپور کا اس سلسلہ میں کیا نقطۂ نظر اور

معمول رہا، ان سب کی روشنی میں دیکھنا چاہئے کہ مولانا سعد صاحب اور دوسرے حضرات کے یہ بیانات کس حد تک درست ہو سکتے ہیں، پھر اس نوع کی غیر محقق باتوں سے تبلیغی عوام الناس کو اصحاب تدریس واہلِ مدارس سے کس درجہ بدگمانیاں ہونے لگیں، اور تکبر وتعلّی اور خود پسندی کا شکار ہوکر وہ کس طرح علماء واہل مدارس کا استخفاف اوران کی شان میں گستاخی وبدزبانی کرنے لگے، العیاذ باللہ، اور یہ سب مرکز نظام الدین کے بعض غیر ذمہ دارانہ بیانات کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے، اب ان حضرات کی ذمہ داری ہے کہ ایسے بیانات سے پوری احتیاط کریں، اور جو کر چکے ہیں اس کے تدارک کی مناسب تدبیریں اختیار کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ اسی نوع کی بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کام اپنے اصل منہج سے ہٹ چکا ہے، کیونکہ ہمارے تبلیغی اکابر حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور حضرت مولانا یوسف صاحبؒ اور مولانا انعام الحسن صاحبؒ نہ ایسا ذہن رکھتے تھے نہ ہی علماء کے لئے جامعیت کا یہ مفہوم بیان فرماتے تھے، اور نہ ہی ایسی باتیں ان کے بیانات میں آیا کرتی تھیں، اب زیر بحث مسئلہ سے متعلق بعض آیات قرآنیہ اوراحادیث مبارکہ اور خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام کا تعامل نیز فقہاء اسلام کی تصریحات اوراس سلسلہ میں اکابر علماء دیوبند وسہارنپور کے معمولات ملاحظہ فرمائیے۔

دینی خدمت پر معاوضہ لینا قرآن پاک سے ثابت ہے

شریعت کا ضابطہ ہے کہ دینی خدمت پر معاوضہ لینا نہ اجر وثواب کے منافی ہے نہ ہی توکل وتقویٰ کے خلاف ہے، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ دینی خدمت پر معاوضہ کا لینا خود قرآن وحدیث، رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور صحابہ کے عمل سے ثابت ہے، اگر یہ خلوص یا اجر وثواب کے منافی ہوتا تو قرآن پاک سے اس کا ثبوت نہ ہوتا، اور آپ خود اس سے منع فرمادیتے، حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا الآية. (سورۂ توبہ پ۱۰)

اس آیت میں زکوٰۃ کے مصارف کو بیان کیا گیا ہے، اور مصارفِ زکوٰۃ میں ایک مصرف عاملین علی الصدقہ کو بھی ارشاد فرمایا ہے، یعنی حکومت کے مقرر کردہ وہ افراد جو زکوٰۃ وصدقات کی وصولیابی کا کام انجام دیتے ہیں، ان کو بھی بیت المال سے زکوٰۃ کی رقم سے معاوضہ دیا جاتا ہے، دوسرے مستحقین زکوٰۃ کو تو فقر واحتیاج کی بناپر زکوٰۃ دی جاتی ہے، لیکن عاملین علی الصدقہ کو ان کے عمل کی بناپر استحقاق ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عامل علی الصدقہ اگر غنی ہے تو بھی وہ اس اجرت کا مستحق اور مصارفِ زکوٰۃ میں شمار ہوتا ہے، البتہ چونکہ اس میں صدقہ کا بھی شبہ ہے، اس لئے سید کے لئے اس کو جائز قرار نہیں دیا گیا، جب کہ بعض فقہاءِ محدثین امام طحاویؒ وغیرہ نے اس کو خالص اجرت مان کر سادات کے لئے بھی جائز قرار دیا ہے۔

اور عامل کے لئے اس اجرت کے استحقاق کی علت جو فقہاء نے بیان کی ہے وہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو اس کام کے لئے فارغ کرلیا ہے، اس لئے وہ اس کا مستحق ہے، فقہاء ومحدثین نے اس کی تصریح فرمائی ہے، چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

امام نوویؒ حدیث: "إن الصدقة لا تنبغي لآل محمد" کے تحت فرماتے ہیں، جس کو شیخ عثمانیؒ نے اپنے شرح میں نقل فرمایا ہے:

فيه دليل على أنها محرمة عليهم سواء كانت بسبب العمل أو بسبب الفقر والمسكنة وغيرهما من الأسباب الثمانية وهذا هو الصحيح عند أصحابنا.

قال الشيخ العثماني في شرح المسلم: وأجازها الطحاوى وغيره للعاملين منهم (أى من آل محمد) لأنها أجرة، وقال ابن عابدين فلا تحل للعامل الهاشمي تنزيهاً لقرابة ﷺ عن شبهة الوسخ.

(فتح الملہم شرح مسلم ص۱۰۱، ج۳،مطبوعہ لاہور، باب تحريم الزكوٰة على رسول الله ﷺ)

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں: **ولنا أن ما يستحق العامل إنمايستحقه بطريق العُمَالة لا بطريق الزكوٰة بدليل أنه يعطى وإن كان غنياً بالإجماع ولو كان ذلك صدقةً لما حلت للغني.** (البدائع الصنائع ص۴۴، ج۲، فصل وأما الذي يرجع إلى المؤدّیٰ)

علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: **إنما حلت للغنی مع حرمة الصدقة علیه لأنه فرغ نفسه لهذا العمل، فیحتاج إلی الکفایة والغنی لا یمنع من تناولها عند الحاجة کابن السبیل.** (البحر الرائق، کتاب الزکوۃ، باب المصرف ص۴۲، ج۲)

والتحقیق أن فیه شبهاً بالأجرة وشبهاً بالصدقة فللأول یحل للغنی.....

وللثاني لا یحل للهاشمی. (البحر الرائق ص۴۲۱، ج۲)

مذکورہ بالا تصریحات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ عامل علی الصدقہ یعنی وہ شخص جس کو حاکم وقت زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے مقرر کرتا ہے اس کو اس کے عمل عوض جو کچھ دیا جاتا ہے اس کی حیثیت اجرت اور عوض کی ہے، جس کو شریعت میں عمالہ کہتے ہیں، قرآن نے بھی عاملین علی الصدقہ کو عُمالہ یعنی ان کے عمل کی اجرت دینے کو کہا ہے۔

اور رسول اللہ ﷺ نے بھی اس کے مطابق عمل کیا، چنانچہ آپ نے حضرت عمرؓ کو جب اس کام کے لئے بھیجا تھا تو آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو عُمالہ دیا، لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے لینے سے انکار کیا، اور یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے یہ کام تو اجر وثواب کے لئے کیا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو اصرار سے دیا، پھر حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ابن ساعدی مالکی کو اس کام کے لئے بھیجا تو حضرت عمرؓ نے بھی ان کو عُمالہ دیا، انہوں نے بھی اس کے لینے سے انکار کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کو اصرار سے دیا، جیسا کہ مسلم شریف کی مندرجہ ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے:

عن بسر بن سعید عن ابن الساعدي المالکي أنه قال: استعمل عمر بن الخطابؓ علی الصدقة فلما فرغت منها وأدیتها إلیه أمر لی بعمالة فقلت: إنما عملت لله، وأجري علی الله، فقال: خذ ما أعطیت، فإني عملت علی عهد رسول الله ﷺ فعملنی فقلت مثل قولک، فقال لی رسول الله ﷺ إذا أعطیت شیئاً من غیر أن تسئل فکل وتصدق.

(مسلم شریف، کتاب الزکوۃ، حدیث ۲۴۰۵)

قال النووی قوله أمر لی بعمالة هی بضم العین وهی المال الذي یعطاء العامل علی عمله. (مسلم شریف ص۳۳۵، ج۱)

جب یہ یقینی بات ہے کہ فقہاء ومحدثین کی تصریح کے مطابق اس کی حیثیت اجرت کی ہے، اور عامل کو اس کے عمل ہی کی اجرت دی جاتی ہے، تو کیسے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کا یہ عمل اجر وثواب کے منافی یا تقویٰ وتوکل کے خلاف ہے۔

کیونکہ اسی عامل کے بارے میں تو (جس کو اس کے عمل کا عوض دیا جاتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ عامل الصدقہ جو اس خدمت کو انجام دیتا ہے، ایسا ہے جیسے مجاہد فی سبیل اللہ، یعنی اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا ثواب ملتا ہے، چنانچہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے:

عن رافع بن خدیج قال سمعت رسول الله ﷺ یقول: العامل علی الصدقة بالحق کالغازي في سبیل الله حتیٰ یرجع إلی بیته. (ترمذی شریف، حدیث ۶۴۰، باب ما جاء في العامل علی الصدقة بالحق، تحفۃ الاحوذی ص۲۴۷، ج۳)

دیکھئے عامل علی الصدقہ جو اجرت اور عوض کے ساتھ ایک دینی خدمت کو انجام دیتا ہے اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ اس کا ثواب ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کا ثواب۔

علامہ ابن العربیؒ اس حدیث پاک کی شرح میں تحریر فرماتے ہیں:

والعامل علی الصدقة خلیفة الغازي لأنه یجمع مال سبیل الله فهو غاز بعمله وهو غاز بنیته.

.....کما لا بد من الغزو فلا بد من جمع المال الذي یغزو به، فهما شریکان فيالنیة شریکان في العمل فوجب أن یشترک في الأجر انتهیٰ. (ترمذی شریف، حدیث ۶۴۰، باب ما جاء في العامل علی الصدقة بالحق، تحفۃ الاحوذی ص۲۴۷، ج۳)

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے اتنی بات تو یقینی طور پر معلوم ہوگئی کہ تنخواہ اور اجرت لینے کے بعد بھی اجر وثواب کا استحقاق ہوتا ہے، جبھی تو رسول اللہ ﷺ نے عامل علی الصدقہ کو غازی فی سبیل اللہ کے برابر ثواب کا مستحق قرار دیا، جبکہ عامل علی الصدقہ یقیناً اپنے عمل کی اجرت لیتا

ہے، اوراس کا اپنے عمل کا عوض لینا قرآن وحدیث اور سیرت نبوی ﷺ اور صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے، پھر کیونکر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دینی کام پر معاوضہ لینے سے اجر وثواب کا استحقاق نہیں رہتا، یہ بات تو قرآن وحدیث اور سنت کے خلاف ہے۔

تنبیہ: یہ بات یاد رکھنے کی ہے کتاب وسنت کی روشنی میں صرف عاملین ہی کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کو زکوٰۃ کی رقم ان کے عمل کے عوض میں دی جاسکتی ہے، اس کے علاوہ کسی بھی موقع میں کسی بھی شخص کو اس کے عمل کے عوض تنخواہ وغیرہ میں زکوٰۃ کی رقم نہیں دی جاسکتی، نہ ائمہ ومؤذنین کو، نہ مدرّسین ومجاہدین کو، البتہ بیت المال کہ دوسری مدّات (جو زکوٰۃ کے علاوہ بیت المال میں جمع کی جاتی ہیں ان سے) اور امدادی رقوم سے دی جاسکتی ہے، فقہاء کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے۔

دینی خدمت پر معاوضہ معاش کی بہترین صورت ہے جو اجر وثواب کے منافی نہیں

مسلم شریف کی روایت میں ہے:

عن أبی هريرة عن رسول الله ﷺ أنه قال من خير معاش الناس لهم رجل ممسک عنان فرسه فی سبيل الله يطير علی متنه، كلما سمع هيعة أو فظعة طار عليه يبتغی القتل الخ. (مسلم شریف باب فضل الجهاد و الرباط، حدیث ۴۸۶۶)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں میں سب سے بہتر معاش مجاہد فی سبیل اللہ کا ہے، جو اللہ کے راستہ میں گھوڑے کی لگام کو تھامے ہوئے اس کی پشت پر سوار ہوکر دوڑتا پھرتا ہے، جہاں کہیں پُر خطر یا سنگین حالات کی خبر پاتا ہے گھوڑے پر سوار ہوکر قتل سے بے خوف ہوکر شہادت کی خواہش میں اک دم چل دیتا ہے۔

مطلب یہ کہ جو مجاہد عوض اور تنخواہ لے کر جہاد کرتا ہے اور حالت اس کی یہ ہے کہ جہاد میں اتنا نشیط اور مستعد رہتا ہے کہ جہاں بھی کہیں سنگین اور پر خطر حالات پیش آتے ہیں تو میدان میں کودنے کے لئے ہر دم تیار رہتا ہے۔

شرّاحِ حدیث نے اس کی تشریح میں فرمایا ہے کہ معاش اور کمائی کے طریقوں میں سب سے بہتر اور افضل طریقہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق جہاد ہے، بشرطیکہ جہاد سے اس کا مقصود اعلائے کلمۃ اللہ ہی ہو، یعنی وہ اپنے جہاد میں مخلص ہو، چنانچہ فتح الملہم شرح مسلم میں اسی حدیث کے تحت علامہ قرطبیؒ سے نقل فرمایا ہے:

أی خير طرق الكسب الجهاد لكن إذا كان أصل النية في الجهاد إعلاء كلمة الله تعالیٰ. (فتح الملہم ص ۳۴۸، ج ۹)

قاضی عیاض مالکیؒ فرماتے ہیں کہ: اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ کسب یعنی کمائی اور معاش کی نیت سے جہاد کرنا اور مالِ غنیمت کو حاصل کرنا یہ اجر وثواب کے منافی نہیں، جبکہ اصل مقصود جہاد ہی ہو۔

قال القاضي عياض: فيه أن نية الكسب وأخذ الغنيمة لا تؤثر في الأجر ولكن إذا كان الباعث له قصد الجهاد بدليل قوله في الحديث: "يبتغی القتل" (فتح الملہم ص ۳۴۸، ج ۹)

مذکورہ بالا تصریح سے حدیث پاک کی روشنی میں واضح طور پر یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی دینی خدمت میں معاوضہ لینے اور حصولِ مال کی نیت کے بعد بھی اجر وثواب میں کمی نہ ہوگی، اور کمائی کی نیت کرنا اجر وثواب کے حاصل ہونے میں مخل نہ ہوگا، بلکہ حدیث پاک کی رو سے اس کا خیر المعاش یعنی کمائی کا بہترین ذریعہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے تمام فقہاء نے بھی کسب معاش کے طریقوں میں سے سب سے بہتر طریقہ جہاد کو قرار دیا ہے اس کے بعد تجارت صناعت وغیرہ، چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

أفضل أسباب الكسب الجهاد ثم التجارة ثم الزراعة ثم الصناعة كذا في الإختيار. (فتاویٰ عالمگیری ص ۳۴۹، ج ۵)

علامہ ابن نجیمؒ البحر الرائق میں تحریر فرماتے ہیں:

قال أصحابنا أفضل الكسب بعد الجهادالتجارة ثم الحراثة ثم الصناعة. (البحر الرائق ص۴۳۹، ج۵)

اسی حقیقت کو حافظ ابن حجرؒ نے بھی شرح بخاری میں تحریر فرمایا ہے جس کا حاصل یہ کہ:

کسب ومعاش کے طریقوں میں سب سے افضل اور بہتر طریقہ جہاد ہے، یعنی یہ کہ آدمی فی سبیل اللہ جہاد کرے اور اس میں اس کو جو معاوضہ یا مالِ غنیمت حاصل ہو اس سے اپنا گزر بسر کرے، رسول اللہ ﷺ کا بھی گزر بسر اسی طرح ہوتا تھا، مکاسب معاش کے تمام طریقوں میں سب سے بہتر طریقہ جہاد اس لئے ہے کہ اس میں مکسب کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ بھی ہوتا ہے، اور دشمنوں کا مغلوب کرنا بھی ہوتا ہے، نیز اس میں آخرت کا نفع یعنی اجر وثواب بھی ہوگا، چنانچہ بخاری شریف کے ''**باب كسب الرجل والعمل بيده**'' کے تحت حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

وفوق ذلک من عمل اليد ما يكتسب من أموال الكفار بالجهاد وهو مكسب النبي ﷺ وأصحابه وهو أشرف المكاسب لما فيه من إعلاء كلمة الله تعالىٰ وخذلان كلمة أعدائه ونفع الأخروى. (فتح الباری ص۳۰۴، ج۴)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''صاحب بحر فرماتے ہیں کہ ہمارے فقہاء احناف کے نزدیک جہاد کے بعد کمائی کا سب سے افضل طریقہ تجارت ہے، پھر زراعت، پھر صناعت وحرفت ہے'' (فضائل تجارت ص۵۱)

یعنی پیشوں میں سب سے افضل پیشہ تجارت ہے، لیکن جہاد کے بعد، یعنی جہاد کے ذریعہ کسب کرنا تجارت سے بھی افضل ہے۔

مذکورہ بالا نصوص اور شراحِ حدیث وفقہاء کی تصریحات سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ جہاد کے ذریعہ کسب کرنا یا جہاد پر تنخواہ اور معاوضہ لینا خیر المکاسب وخیر المعاش یعنی کمائی کے طریقوں میں سب سے بہتر طریقہ ہے، جو اجر وثواب کے ہرگز منافی نہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تمام مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں، اور اس جہاد کو جو عوض اور تنخواہ کے ساتھ کیا جائے اجر وثواب کے منافی نہ سمجھا تھا۔

چنانچہ علامہ شبلیؒ نے اپنی کتاب ''الفاروق'' میں اس کی تفصیل ذکر فرمائی ہے، جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''.....اس کے بعد (حضرت عمر فاروقؓ نے) تنخواہوں کی ترقی کی طرف توجہ کی، کیونکہ وہ فوج کو زراعت، تجارت اور اس قسم کے تمام اشغال سے بزور باز رکھتے تھے، اس لئے ضروری تھا کہ ان کی تمام ضروریات کی کفالت کی جائے، اس لحاظ سے تنخواہوں میں کافی اضافہ کیا، ادنیٰ سے ادنیٰ شرح جو دو سو سالانہ تھی، تین سو کر دی، افسروں کی تنخواہ سات ہزار سے لے کر دس ہزار تک بڑھادی'' (الفاروق ص۲۳۳)

''تنخواہوں میں قدامت اور کارکردگی کے لحاظ سے وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا تھا، قادسیہ میں زہرہ، عصمۃ وغیرہ نے بڑے بڑے مردانہ کام کئے تھے اس لئے ان کی تنخواہیں دو دو ہزار سے ڈھائی ڈھائی ہزار ہوگئیں، مقررہ رقموں کے علاوہ غنیمت سے وقتاً فوقتاً جو ہاتھ آتا تھا اور علیٰ قدر مراتب فوج پر تقسیم ہوتا تھا، اس کی کچھ انتہا نہیں تھی، چنانچہ جلولا میں نو نو ہزار، نہاوند میں چھ چھ ہزار درہم ایک سوار کے حصہ میں آئے تھے''

(الفاروق ص۲۳۵)

''تنخواہوں کی تقسیم کا یہ طریقہ تھا کہ ہر قبیلہ کے ساتھ ایک عریف یعنی مقدم یا رئیس ہوتا تھا، فوجی افسر جو کم از کم دس دس سپاہیوں پر افسر ہوتے تھے، اور جو امراء الاعشار کہلاتے تھے، تنخواہ ان کو دی جاتی تھی، وہ عریف کے حوالے کرتے تھے، اور عریف اپنے اپنے قبیلے کے سپاہیوں کے حوالے کرتے تھے، اور ایک ایک عریف کے متعلق ایک ایک لاکھ درہم کی تقسیم ہوتی تھی، چنانچہ کوفہ وبصرہ میں سو عریف تھے، جن کے ذریعہ سے ایک کروڑ کی رقم تقسیم ہوتی تھی'' (الفاروق ص۲۳۴)

''غرض اس ہدایت کے موافق رجسٹر تیار ہوا اور حسب ذیل تنخواہیں مقرر ہوئیں:

(۱) جو لوگ جنگ بدر میں شریک تھے ۵/ہزار (۲) مہاجرین حبش اور شرکائے جنگ احد ۴/ہزار (۳) فتح مکہ کے پہلے جن لوگوں نے

ہجرت کی ۳/ ہزار (۴) جولوگ فتح مکہ میں ایمان لائے ۲/ ہزار (۵) جولوگ جنگ قادسیہ اور یرموک میں شریک تھے ۲/ ہزار (۶) اہل یمن ۴/ سو درہم (۷) قادسیہ اور یرموک کے بعد کے مجاہدین ۳/ سو درہم (۸) بلا امتیاز مراتب ۲/ سو درہم'' (الفاروق ص ۲۲۴، مطبوعہ لاہور)

حضرت امام مسلمؒ نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حوالہ سے تحریر فرمایا ہے کہ انہوں نے یہ ضابطہ مقرر کر رکھا تھا کہ مجاہدین کی صف میں شامل ہونے والے اگر پندرہ سال کی عمر کے ہیں تو ان کی تنخواہ اور وظیفہ مقرر کیا جائے اور جو پندرہ سال سے کم کے ہوں ان کو وظیفہ اور تنخواہ کا استحقاق نہیں ہوگا، چنانچہ مسلم شریف میں ہے:

''قال نافع فقدمت على عمر بن عبدالعزيز وهو يومئذ خليفة فحدثته هذا الحديث (اى عن ابن عمر قال عرضنى رسول اللهﷺ يوم أحد في القتال وأنا ابن أربع عشرة سنة فلم يجزنى وعرضنى يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة سنة فأجازنى) فقال: إن هذا لحدّ بين الصغير والكبير، فكتب إلى عماله أن يفرضوا لمن كان ابن خمس عشرة سنة ومن كان دون ذلك فاجعلوه في العيال. (مسلم شریف، کتاب الامارۃ، باب بیان سن البلوغ، حدیث ۴۸۱۴، فتح الملہم ص ۳۱۷، ج ۹)

قابل غور بات یہ ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ دین کی اعلیٰ درجہ کی خدمت اور بڑے درجہ کی عبادت ہے، ایسی بڑی عبادت کہ جہاد میں تھوڑی دیر کا قیام بھی لیلۃ القدر میں حرم پاک میں حجر اسود کے سامنے عبادت کرنے سے زیادہ افضل ہے، چنانچہ ابن حبان کی روایت میں ہے:

موقف الساعة في سبيل الله خير من قيام ليلة القدر عند الحجر الأسود. (رواہ ابن حبان ص ۴۶۳، ج ۱)

جب اس میں تنخواہ لینا اجر وثواب کے منافی نہیں اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے مجاہدین کے لئے وظائف اور تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں، تو دین کی دوسری خدمات تعلیم وتدریس پر اجرت لینا اجر وثواب کے منافی کس دلیل سے ہو جائے گا؟

تعلیم وتدریس بھی جہاد کی ایک قسم ہے

شریعت مقدسہ میں جہاد کے مختلف اقسام وانواع ہیں، تعلیم وتعلّم اور درس تدریس بھی جہاد کی ایک نوع ہے، خود رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: **جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم.** (مشکوٰۃ شریف، کنز العمال ص ۱۰۸۷۱)

یعنی مشرکین سے جہاد کرو اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعہ۔

علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اور شارحِ حدیث حافظ ابن حجرؒ، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ وغیرہ نے جہاد کے مختلف اقسام وانواع تفصیل سے بیان کئے ہیں، منجملہ ان کے تعلیم وتدریس اور تبلیغ بھی جہاد کی اہم قسم ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

الجهاد شرعا بذل الجهد فى قتال الكفار، ويطلق أيضا علىٰ مجاهدة النفس والشيطان والفساق، فأما مجاهدة النفس فعلى تعلّم الدين ثم العمل بها ثم على تعليمها، وأما مجاهدة الشيطان فعلى دفع مايأتى به من الشبهات ومايزينه من الشهوات، وأما مجاهدة الكفار فتقع باليد والمال واللسان والقلب، وأما مجاهدة الفساق فباليد، ثم اللسان، ثم القلب. (فتح الباری، ص ۳، ج ۶، بذل المجہود شرح ابوداود، کتاب الجہاد ص ۳۰۰ ج ۳ ہندیہ)

علامہ ابن قیمؒ نے زاد المعاد میں اس کی مزید تفصیل ذکر فرمائی ہے۔

امام ابوبکر جصاص رازیؒ نے جہاد کی دوسری تمام قسموں کے مقابلہ میں علمی جہاد کو بعض حیثیتوں سے سب سے افضل قرار دیا ہے کیونکہ جہاد کی تمام قسمیں علمی جہاد ہی پر موقوف ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

فان قيل فاى الجهادين افضل أجهاد النفس والمال أم جهاد العلم؟ قيل له الجهاد بالسيف مبنى على جهاد العلم وفرع عليه، لانه غير جائز أن يعدوا فى جهاد السيف مايوجبه العلم، فجهاد العلم اصل وجهاد النفس فرع والأصل اولىٰ بالتفضيل من الفرع. (احکام القرآن ص ۱۱۹ ج ۳)

امام ابوبکر جصاص رازیؒ کے فیصلہ کے مطابق تو تعلیم وتعلم یعنی علم دین کا سیکھنا سکھلانا بعض حیثیت سے جہاد بالسیف سے بھی افضل ہے، کیونکہ جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم جہاد بالسیف ہے اور وہ بھی علم دین ہی پر موقوف ہے لہٰذا وہ فرع اور علمی جہاد اصل ٹھہرا، اسی طرح باقی جہادوں کو سمجھنا چاہئے، واللہ اعلم۔

شراح کی مذکورہ بالا تصریح سے معلوم ہوا کہ جہاد کے مختلف انواع ہیں اور تعلیم وتعلّم، درس وتدریس بھی جہاد کی ایک نوع ہے تو جب جہاد کی سب اعلیٰ قسم جہاد بمعنیٰ قتال اس میں تنخواہ کا لینا دینا جائز اور اجر وثواب کے منافی نہیں، اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو خیر المعاش قرار دیا ہے، اور ہمارے فقہاء نے اس کو تجارت سے افضل قرار دیا ہے اور اس پر تنخواہ کے لین دین کو اجر وثواب کے منافی نہیں سمجھا گیا تو جب سب سے اعلیٰ درجہ کے جہاد میں تنخواہ لینا رسول اللہ ﷺ کے فرمان اور خلفائے راشدین کے عمل سے ثابت ہے تو جہاد کے دوسرے انواع میں بھی وظائف اور تنخواہ کا لینا بدرجۂ اولیٰ جائز اور ثابت ہوگا اور یہ لین دین بھی اجر وثواب کے منافی نہیں ہوگا، یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے بھی دین کی دوسری اہم خدمات پر ضرورت کے مطابق وظیفہ اور معاوضہ لینے کو بلا تکلف گوارہ کیا، اور ہمارے فقہاء نے بھی امیر المؤمنین اور قاضیوں ومفتیوں اور مدرّسوں کے لئے اس کے جواز کی تصریح فرمائی ہے، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

دینی خدمت پر وظیفہ اور تنخواہ لینے کے متعلق خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کا عمل

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا عمل

سیرتِ صحابہ اور خلفائے راشدین کے حالات پر نظر کرنے سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات دینی خدمات پر اجرت اور وظیفہ لینے کو نہ خلافِ شرع اور مکروہ سمجھتے تھے اور نہ ہی تقویٰ وتوکل کے خلاف، اور اجر وثواب کے منافی سمجھتے تھے، بلکہ بغیر کسی کراہت وقباحت کے اس کے لینے کو درست اور پاکیزہ مال سمجھتے تھے، چنانچہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما امیر المؤمنین کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور دینی خدمتوں کے انجام دینے پر بیت المال سے وظیفہ لیا کرتے تھے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے امیر المومنین بن جانے کے بعد چاہا بھی کہ گھر کے خرچ کے لئے حسبِ سابق تجارت کے سلسلہ کو باقی رکھیں، لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے ان کو تجارت کرنے سے منع فرمادیا، اور فرمایا کہ حضرت اگر آپ تجارت میں لگیں گے تو امارت کی ذمہ داریوں اور مسلمانوں کے معاملات حل کرنے کے فرائض کون انجام دے گا، دونوں کام ایک ساتھ نہیں ہوسکتے، آپ تجارت نہ کیجئے اور گھر کے خرچ کے لئے بیت المال سے وظیفہ اور تنخواہ لیجئے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ وظیفہ لینے پر تیار ہوگئے، بخاری شریف کی روایت میں ہے:

أن عائشة قالت لما استخلف ابوبكر الصديق قال لقد علم قومي أن حرفتى لم تكن تعجز عن مؤنة أهلي وشغلت بأمر المسلمين فسيأكل آل أبو بكر من هذل المال ويحترف للمسلمين فيه.

(بخاری شریف ہندیہ، باب کسب الرجل وعمله بیده ص۱۷۸، ج۱)

حضرات شیخین حضرت صدیق اکبر وعمر فاروق رضی اللہ عنہما کی یہ مکالمت بہت معروف ومشہور ہے، جس کو محدثین اور اہلِ سیر کے علاوہ فقہاء متقدمین نے بھی بطور دلیل کے نقل کیا ہے، بلکہ علامہ عینیؒ نے تو یہاں تک نقل فرمایا ہے کہ مشورہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لئے جو وظیفہ طے ہوا تھا اس کی مقدار دو ہزار یا ڈھائی ہزار تھی، اس پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میرے بال بچے ہیں، ان سب کے لئے یہ مقدار ناکافی ہے چنانچہ مشورہ سے مزید پانچ سو کا اضافہ کیا گیا، چنانچہ عمدۃ القاری شرح بخاری میں ہے:

وعن ميمون قال لما استخلف ابوبكر جعلوا له الفين، فقال زيدونى فان لى عيالاً فزادوه خمس مائة.

(عمدۃ القاری شرح بخاری باب کسب الرجل وعمل بیده ص۱۸۵، ج۱۱)

قال السرخسی فی المبسوط: وتجب للإمام نفقته فی بیت المال قدر ما یغنیه یفرض له ذلک لما روی أن أبا بکرؓ لما استخلف رآه عمر یجعل شیئاً من متاع أهله فقال إلی أین یا خلیفة رسول اللهﷺ ؟فقال إلی السوق أبیع متاعاً لأهلی لأنفقه فی حوائجی، فجمع الصحابة وفرضوا له کل یوم درهمین وثلثی درهم أو ثلاثة دراهم وثلثا درهم علی ما اختلف الروایات فیه .....وعمر فی خلافته کان یاخذالکفایة من بیت المال علی ما روی عنه أنه قال إن الجزور ینحر کل یوم والعنق منه لآل عمرو ،أما عثمانؓ فکان لا یأخذ شیئاً من بیت المال لثروته ویساره، وأما علیؓ فکان یأخذ علی ما روی أنه قال إن مالی من مالکم کل یوم قصعتا ثرید. (مبسوط سرخسی ص۱۹، ج۳)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اپنی کتاب ''حکایاتِ صحابہ'' میں نقل فرماتے ہیں:

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے یہاں کپڑے کی تجارت ہوتی تھی، اوراسی سے گزراوقات تھا، جب خلیفہ بنائے گئے تو حسبِ معمول صبح کو چند چادریں ہاتھ پرڈال کر بازار میں فروخت کے لئے تشریف لے چلے، راستے میں حضرت عمرؓ ملے، پوچھا کہاں چلے؟ فرمایا: بازار جارہا ہوں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ اگر تم تجارت میں مشغول ہوگئے تو خلافت کے کام کا کیا ہوگا؟ فرمایا: پھر اہل وعیال کو کہاں سے کھلاؤں؟ عرض کیا کہ ابوعبیدہ جن کو حضورﷺ نے امین ہونے کا لقب دیا ہے، ان کے پاس چلیں، وہ آپ کے لئے بیت المال سے کچھ مقرر کردیں، دونوں حضرات ان کے پاس تشریف لے گئے، تو انہوں نے ایک مہاجری کو جو اوسطاً ملتا تھا نہ کم نہ زیادہ، وہ مقرر فرمادیا۔ (حکایاتِ صحابہ باب سوم، قصہ۴، ص۴۸)

حضرت عمر فاروقؓ کا عمل

یہی حال حضرت عمر فاروقؓ کا بھی تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد جب وہ خلیفہ بنائے گئے، حالانکہ وہ خود بڑے درجہ کے تاجر تھے، لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس سے قبل وہ جو مشورہ دے چکے تھے، اُسی کے مطابق اپنے متعلق بھی انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ تجارت وخلافت کی ذمہ داریوں کو ایک ساتھ انجام دینا دشوار تر ہے، دونوں کام ایک ساتھ انجام نہیں دیئے جاسکتے، اس لئے تجارت بند کرکے ان ذمہ داریوں کو انجام دینے اور بیت المال سے وظیفہ لینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں، چنانچہ آپ نے تجارت کے سلسلہ کو بند کردیا اور گھریلو ضروریات کے لئے بیت المال سے وظیفہ اور تنخواہ لینے کو ضروری سمجھا۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ اپنی کتاب حکایاتِ صحابہ میں نقل فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ بھی تجارت کیا کرتے تھے، جب خلیفہ بنائے گئے تو بیت المال سے وظیفہ مقرر ہوا، مدینہ طیبہ میں لوگوں کو جمع کرکے ارشاد فرمایا کہ میں تجارت کیا کرتا تھا، اب تم لوگوں نے اس میں مشغول کردیا، اس لئے اب گزارے کی کیا صورت ہو؟ لوگوں نے مختلف مقداریں تجویز کیں، حضرت علی کرم اللہ چپ بیٹھے تھے، حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا تمہاری کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا توسط کے ساتھ جو تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو کافی ہوجائے، حضرت عمرؓ نے اس رائے کو پسند فرمایا اور قبول کرلیا، اور متوسط مقدار تجویز ہوگئی'' (حکایاتِ صحابہ باب سوم، قصہ۵، ص۴۹)

حضرت عمر فاروقؓ کا دوسرا واقعہ

مسلم شریف کی کتاب الزکوۃ میں ابن الساعدی المالکی کا واقعہ نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو حضرت عمر فاروقؓ نے زکوٰۃ کی وصولیابی کے لئے عامل بناکر بھیجا، جب میں اس عمل سے فارغ ہوا اور وصول کی ہوئی زکوٰۃ آپ کو پہنچادی تو آپ نے مجھے عمالہ دیا یعنی میرے اس عمل کی اجرت مجھے عطا فرمائی، میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ خدمت اللہ کے واسطے کی ہے، مجھے اجرت نہیں چاہئے، میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا جو دے رہا ہوں اس کو لے لو، میرے ساتھ بھی یہی قصہ پیش آیا تھا کہ میں نے رسول اللہﷺ کے زمانہ میں آپ کے حکم سے یہ خدمت انجام دی تھی تو رسول اللہﷺ نے مجھ کو بھی میرے اس عمل کی اجرت دی، تو میں نے بھی تمہاری طرح رسول اللہﷺ سے یہی عرض کیا تھا کہ میرا اجر

اللہ کے پاس، لیکن رسول اللہ ﷺ نے مجھ کو اصرار سے دیا۔

عن ابن الساعدی المالکی أنه قال استعملنی عمر بن الخطاب علی الصدقة فلما فرغت منها و أديتها إليه أمر لی بعمالة فقلت إنما عملت لله و أجری علی الله فقال خذ ما أعطيت، فإنی عملت علی عهد رسول الله ﷺ فعمّلنی فقلت مثل قولك فقال لی رسول الله ﷺ إذا أعطيت شيئاً من غير أن تسئل فكل وتصدق. (مسلم شریف کتاب الزکوٰۃ)

اس حدیث کے تحت حضرت امام نووی تحریر فرماتے ہیں کہ: حضرت عمرؓ نے ابن ساعدی مالکی کو جو کچھ عطا فرمایا وہ ان کے عمل کی اجرت تھی، اور اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو اس نوع کی خدمات جو لوگ انجام دیتے ہیں خواہ دینی خدمات ہوں یا دنیوی، اس پر عوض اور اجرت لینا جائز ہے، مثلاً افتاء وقضاء اور شعبہ احتساب (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) وغیرہ، علامہ کی عبارت درج ذیل ہے:

قوله: (عملت علی عهد رسول الله ﷺ فعمّلنی) هو بتشديد الميم أی أعطانی أجرة عملی، وفی هذا الحديث جواز اخذ العوض علی اعمال المسلمين سواء كانت لدين او لدنيا كالقضاء والحسبة وغيرهما، والله اعلم.

(شرح مسلم للنووی باب جواز الاخذ بغیر سوال ص ۳۳۵، ج ۱)

فقہاء اسلام نے بھی عاملینِ صدقہ کو دی جانے والی رقم کو اجرت ہی پر محمول کیا ہے، چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

لأن ما يستحقه منه أجرة عمالته من وجه كما مر، قال فی المعراج: لأن عمالته فی معنی الأجرة.

(ردالمحتار کتاب الزکوٰۃ باب المصرف شامی ص ۶۵، ج ۲ پاکستان)

حضرت زید بن ثابتؓ کا عمل

حضرت عمر فاروقؓ کی مذکورہ بالا حدیث کے تحت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے علامہ طبریؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ اس حدیث میں بہت پختہ اور واضح دلیل ہے اس بات کی کہ جو شخص بھی مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہو وہ اپنی اس خدمت کے عوض تنخواہ لے سکتا ہے، مثلاً والیٔ مسلمین، مفتی وقاضی، مالِ غنیمت اور صدقات کی وصولیابی کرنے والے لوگ اور اس جیسی خدمات کرنے والے دوسرے حضرات، کیونکہ خود رسول اللہ نے ہی حضرت عمرؓ کو ان کے اس عمل کی اجرت عطا فرمائی تھی، اور حضرت عمر فاروقؓ نے ابن ساعدی مالکی کو بھی اسی طرح عطا فرمائی تھی۔

علامہ ابن منذر نے نقل کیا ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ قضاء کی خدمت انجام دیتے اور اس پر اجرت لیا کرتے تھے، اصل عبارت درج ذیل ہے:

وقال الطبری فی حديث عمر الدليل الواضح علی أن لمن شغل بشئی من اعمال المسلمين أخذ الرزق علی عمله ذلك كالولاة والقضاة وجباة الفئی وعمال الصدقة وشبههم لإعطاء رسول الله ﷺ عمر العمالة علی عمله، وذكر ابن المنذر ان زيد بن ثابت كان ياخذ الاجر علی القضاء.

(فتح الملہم شرح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب جواز الاخذ بغیر سؤال ص ۶۸، ج ۳ مطبوعہ پاکستان)

تنخواہ لے کر دینی خدمت انجام دینا اجر وثواب کے منافی نہیں

خلفائے راشدین کے اس طرزِ عمل سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ وہ حضرات دینی خدمات پر معاوضہ اور تنخواہ لینے، یا تنخواہ لے کر دینی خدمات انجام دینے کو نہ تو کل وتقویٰ کے خلاف سمجھتے تھے اور نہ ہی اجر وثواب کے منافی، خلفائے راشدین کے اس طرزِ عمل میں دیگر صحابہ بھی شریک تھے، جیسا کہ اوپر گزرا، جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اجر واجرت یعنی تنخواہ اور اجر وثواب دونوں جمع نہیں ہو سکتے، اور اجرت لے کر اجر وثواب کا استحقاق نہیں رہتا، یہ اُن کی بہت بڑی غلطی ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ چوں کہ حضرات خلفائے راشدین وظیفہ لیا کرتے تھے، اس لئے امیر المومنین

کے فرائض انجام دینے پر امارت کے اجر وثواب سے وہ محروم رہیں گے؟

مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ سات آدمی کل قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے نیچے ہوں گے، اور ان کا خوب اکرام واعزاز کیا جائے گا، ان سات میں امامِ عادل یعنی امیر المومنین بھی ہوگا۔ (مسلم شریف کتاب الزکوٰۃ باب فضل اخفاء الصدقہ فتح الملہم ص ۵۷، ج ۳، پاکستان)

اور ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ قیامت کے دن تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ اللہ کا محبوب امامِ عادل ہوگا۔

عن ابی سعید مرفوعاً أحب الناس إلى الله يوم القيامة وأقربهم منه مجلساً إمام عادل. (فتح الملہم ص ۵۷، ج ۳، پاکستان)

اب غور کرنا چاہئے کہ کسی دینی خدمت پر وظیفہ اور تنخواہ لینا اگر اجر وثواب کے منافی ہے اور تنخواہ لے کر دینی خدمات انجام دینے میں اجر وثواب باقی نہیں رہتا تو اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ چونکہ امیر المومنین بننے کے بعد اپنی اس ذمہ داری اور دینی خدمت انجام دینے پر چونکہ وظیفہ لیا کرتے تھے، اس لئے وہ بھی ثواب سے محروم رہیں گے، اور مذکورہ بالا احادیث مبارکہ میں امامِ عادل کی جو فضیلت بیان کی گئی ہے، یعنی عرش کا سایہ نصیب ہونا، حق تعالیٰ کا خاص قرب اور مقامِ محبوبیت حاصل ہونا، یہ اجر وثواب بھی حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو نہیں ملے گا، کیونکہ یہ دونوں حضرات بھی تنخواہ اور وظیفہ لیا کرتے تھے، کیا امت میں کوئی اس کا بھی قائل ہوسکتا ہے؟ ہم اہل سنت والجماعت کا عقیدہ تو یہی ہے کہ پوری امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہی ہیں، اور ائمہ عادلین اور امراء المسلمین میں سب سے اعلیٰ مقام اور عرشِ الٰہی میں سب سے افضل مقام اور پوری امت میں سب سے زیادہ حق تعالیٰ کا قرب اور مقامِ محبوبیت حضرات شیخین ہی کو ملے گا، گو وہ اپنی دینی ذمہ داریوں کے انجام دینے پر تنخواہیں لیا کرتے تھے، اہل سنت والجماعت کا کوئی فرد اس کے خلاف نہیں کہہ سکتا۔

اجر وثواب کا مدار خلوص وقلوب پر ہے نہ کہ تنخواہ اور فلوس پر

وجہ اس کی یہی ہے جس کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دینی خدمات پر معاوضہ وتنخواہ لینا ہرگز اجر وثواب کے منافی نہیں، کیونکہ ثواب کا مدار تو خلوص پر ہے، اور خلوص کا مدار قلوب پر ہے، نہ کہ فلوس پر، ہوسکتا ہے کہ ایک شخص تنخواہ لے کر پڑھا رہا ہو، لیکن اس کا قلب اخلاص سے پُر ہو، یعنی با تنخواہ پڑھانے میں بھی وہ پورے طور پر مخلص ہو، اور بہت ممکن ہے کہ ایک شخص بغیر تنخواہ کے پڑھا رہا ہو لیکن اس کا قلب اخلاص سے خالی ہو، محض شہرت وجاہ کے لئے، یا دیگر اغراض فاسدہ کی وجہ سے بغیر تنخواہ کے پڑھا رہا ہو، اس لئے علمائے محققین کی تحقیق یہی ہے کہ تنخواہ لے کر پڑھانا ہرگز خلوص اور اجر وثواب کے منافی نہیں، واللہ اعلم۔

شرعی دلیل

حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے جو کچھ ارشاد فرمایا کہ: دینی تعلیم پر اجر وثواب کا مدار محض خلوص پر ہے یعنی وہ کام اللہ کے واسطے ہو، نام ونمود اور شہرت کے لئے نہ ہو، تنخواہ لینے نہ لینے پر اس کا مدار نہیں، حضرت تھانویؒ کا یہ فرمان حدیث پاک کے بالکل موافق اور اُصولِ شرع کے بالکل مطابق ہے، چنانچہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ قاری اور عالم کو بلا کر اس سے پوچھے گے کہ ہم نے تم کو علم کی نعمت سے نوازا تھا، تم نے کیا کیا؟ وہ کہے گا ہم نے پڑھا پڑھایا لوگوں کو سکھلایا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے یہ سب اِس لئے کیا تھا تا کہ تیرا نام اور شہرت ہو کہ یہ بڑا عالم اور بڑا قاری ہے، سو کہا جا چکا، یعنی پڑھنے پڑھانے میں وہ مخلص نہ تھا اس لئے فرشتوں کو حکم ہوگا کہ اس کو چہرے کے بل گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دو، چنانچہ مسلم شریف کی روایت میں ہے:

ورجل تعلّم العلم وعلّمه وقرأ القرآن فأتى به فعرّفه نعمهٗ فعرفها قال: فما عملت فيها؟ قال: تعلّمت العلم وعلّمته، وقرأت فيك القرآن ،قال: كذبت ولكن تعلّمت العلم ليقال عالمٌ، وقرأت القرآن ليقال هو قارئٌ، فقد قيل ثم أمر به فسحب على وجهه حتىٰ ألقي في النار. (مسلم شریف ص ۱۴۰، ج ۲ باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار)

اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت وعدم قبولیت اور اجر وثواب کا مدار خلوص اور للٰہیت پر ہے، نہ کہ تنخواہ لینے یا نہ لینے پر، اگر تنخواہ لینے یا نہ لینے پر ہی قبولیت وعدم قبولیت اور اجر وثواب کا مدار ہوتا تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا کہ تو نے تنخواہ کے واسطے پڑھایا تھا، تنخواہ لے چکا اب یہاں کچھ نہ ملے گا، حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ آپ کے فرمان کے مطابق عدم قبولیت اور ہلاکت اخلاص نہ ہونے اور ریا وشہرت کے جذبے سے کام کرنے کی وجہ سے ہوئی ہے، نہ کہ تنخواہ لینے کی وجہ سے۔

الغرض اس حدیث پاک سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ تنخواہ لینے یا نہ لینے سے اجر وثواب میں کوئی فرق نہیں پڑتا، چنانچہ ہمارے فقہائے اسلام نے اُصول کی کتابوں میں اس کی وضاحت فرمادی ہے کہ تمام طاعات اور دینی خدمات پر ثواب کا مدار حسنِ نیت اور خلوص پر ہی ہے، چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ اپنی کتاب ''الأشباه والنّظائر'' میں تحریر فرماتے ہیں:

الفنّ الأول، القاعدة الأولىٰ: لا ثواب إلا بالنية ....وعلى هذا سائر القرب لا بدّ فيها من النية بمعنىٰ توقف حصول الثواب على قصد التقرّب بها إلى الله تعالىٰ من نشر العلم تعليماً وإفتاءً وتصنيفاً.

قال الحموى والعبادة: ما يثاب على فعلهٖ ويتوقف على نية. (الاشباه والنّظائر مع شرح الحموی القاعدة الأولیٰ ص۸۵)

علامہ ابن نجیمؒ کی اس تصریح سے معلوم ہوا کہ تعلیم وتدریس اور افتاء وتصنیف جیسی دینی خدمات میں اجر وثواب کا مدار حسنِ نیت اور اخلاص وللٰہیت پر ہی ہے، نہ کہ تنخواہ لینے یا نہ لینے پر، لہٰذا یہ کہنا جیسا کہ آج کل بہت سے اصحابِ تبلیغ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اجر لے لو یا اجرت، **إن أجرى إلا على ربّ العالمين**، اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے، یہ بات احادیث مبارکہ اور اُصولِ شرع کے بالکل خلاف ہے، نیز علمائے کرام پر بے جا الزام اور اُن سے بدگمانی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے امت کی حفاظت فرمائے، آمین۔

حضرات صحابہ کا بھی دینی خدمات پر تنخواہ لینے اور دینے کا معمول رہا ہے، چنانچہ تصریحات ملاحظہ ہوں:

حضرت عمرؓ اصرار واہتمام سے دینی خدمات پر تنخواہ دیا کرتے تھے

حضرت عمرؓ کی سیرت اور آپ کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے وقت میں جو صحابہ دینی خدمات پر تنخواہ لینا پسند نہیں کرتے تھے یا خلافِ تقویٰ سمجھتے تھے آپ ان سب کی غلط فہمیاں دور فرماتے اور ان کو اصرار سے وظائف اور تنخواہیں دیا کرتے تھے، اس سلسلہ میں علامہ شبلیؒ نے حضرت عمرؓ کے متعلق بڑی عمدہ بات لکھی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''ایک وقت یہ تھا کہ لوگ کسی خدمت کے معاوضہ میں تنخواہ لینا پسند نہیں فرماتے تھے اور اس کو زہد وتقدس کے خلاف سمجھتے تھے، بعینہٖ اسی طرح جس طرح آج کل کے مقدس واعظوں کو اگر کہا جائے کہ وہ باقاعدہ اپنی خدمتوں کو انجام دیں اور مشاہرہ لیں تو ان کو نہایت ناگوار ہوگا لیکن نذر ونیاز کے نام سے جو رقمیں ملتی ہیں اس سے ان کو احتراز نہیں ہوتا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بھی بہت سے لوگ اس غلطی میں مبتلا تھے، لیکن یہ امر تمدن اور اصولِ انتظام کے خلاف تھا، اس لئے حضرت عمرؓ نے بڑی کوشش سے اس غلطی کو رفع کیا، اور تنخواہیں مقرر کیں، ایک موقع پر حضرت ابوعبیدہؓ نے جو مشہور صحابی اور سپہ سالار تھے حق الخدمت لینے سے انکار کیا، تو حضرت عمرؓ نے بڑی مشکل سے ان کو راضی کیا۔ (الفاروق بحوالۂ طبری ص ۲۵۷)

حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ نے
معلّمین ومدرسین اور ائمہ ومؤذنین کی تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں

علامہ شبلیؒ اپنی مشہور مستند کتاب ''الفاروق'' میں اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کے کارناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''تمام ممالکِ مفتوحہ میں ہر جگہ قرآن مجید کا درس جاری کیا، اور معلّم وقاری مقرر کرکے ان کی تنخواہیں مقرر کیں، چنانچہ یہ امر بھی حضرت عمرؓ

کی اولیات میں شمار کیا جاتا ہے کہ انہوں نے معلموں کی تنخواہیں مقرر کیں، تنخواہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے کم نہ تھیں، مثلاً خاص مدینہ منورہ میں چھوٹے چھوٹے بچوں کی تعلیم کے لئے جو مکتب تھے ان کے معلّموں کی تنخواہیں پندرہ پندرہ درہم ماہوار تھیں''

(حضرت عمر فاروقؓ نے) عمال کو لکھ بھیجا کہ جو لوگ قرآن سیکھیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں۔ (کنز العمال ص ۲۲۴، ج ۱)

حضرت فاروقؓ نے ہر شہر وقصبہ میں امام ومؤذن مقرر کئے اور بیت المال سے ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔

علامہ ابن الجوزیؒ ''سیرت العمرین'' میں لکھتے ہیں:

أن عمر بن الخطاب وعثمان بن عفان كانا يرزقان المؤذنين والائمة. (سیرت العمرین لابن الجوزی)

مؤطا امام محمد سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد نبوی میں صفوں کو درست کرنے کے لئے خاص اشخاص مقرر تھے۔ (مؤطا امام محمد ص ۲۸۶)

(حضرت عمر فاروقؓ نے) تمام ممالکِ محروسہ میں فقہاء ومعلم مقرر کئے کہ لوگوں کو مذہبی احکام کی تعلیم دیں..... ابن جوزیؒ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان فقہاء کی تنخواہیں بھی مقرر کی تھیں، اور درحقیقت تعلیم کا مرتب ومنظّم سلسلہ بغیر اس کے قائم نہیں ہوسکتا تھا۔

(ماخوذ الفاروق ص ۲۴۷ تا ۲۵۴ مطبوعہ لاہور)

یہ ہے تعلیم وتدریس اور دینی خدمات انجام دینے پر معاوضہ لینے کے متعلق خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ خصوصاً حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل، ان سب پر نظر رکھنے کے بعد یقین سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تعلیم قرآن، تعلیم دین، تدریس اور افتاء وقضاء، امامت وموذنی پر تنخواہ لینے دینے کو حضرات خلفائے راشدین ودیگر صحابہ بغیر کسی کراہت کے درست اور جائز نہ صرف جائز بلکہ افضل سمجھتے تھے، اور لینے پر اصرار کرتے تھے، نہ اس کو خلافِ تقویٰ سمجھتے تھے اور نہ ہی اجر وثواب کے منافی، مثلاً ابن ماجہ میں حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ صبح کے وقت جاگ کر تم کتاب اللہ کی ایک آیت سیکھ لو وہ تمہارے لئے سو رکعت پڑھنے سے افضل ہے، اور دین وشریعت کے کسی ایک مسئلہ کو سیکھ لینا ہزار رکعت نماز پڑھنے سے افضل ہے، خواہ اس پر تمہارا عمل ہو یا نہ ہو۔ (ابن ماجہ ص ۲۰، نوادر الحدیث ص ۳۵۰)

عن أبي ذر قال: قال لي رسول الله ﷺ يا ابا ذر! لأن تغدو فتعلم آية من كتاب الله خير لک من أن تصلي مأة ركعةٍ ولأن تغدو فتعلم باباً من العلم عمل به أو لم يعمل خير من أن تصلي ألف ركعات. (ابن ماجہ ص ۲۰)

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم وتعلّم کی اتنی بڑی فضیلت تنخواہ لے کر پڑھانے کے ساتھ بھی حاصل ہوگی، کیونکہ صحابہ کرام اجر واجرت میں کوئی منافاۃ نہیں سمجھتے تھے ورنہ وہ اتنے بڑے اجر وثواب اور اتنی نیکیوں کا نقصان نہیں کرتے، بلکہ نیکیوں کی لالچ میں بغیر تنخواہ ہی کے پڑھاتے، لیکن چونکہ تنخواہ لے کر پڑھانے کو وہ اجر وثواب کے منافی نہیں سمجھتے تھے، اس لئے بلا تأمل تنخواہیں لیتے اور دیتے تھے، یہ ہے صحابہ کرام کا معمول اس سلسلہ میں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام نے بھی اس کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے، ہمارے تمام اکابر علماء دیوبند وسہارنپور کا ہمیشہ تنخواہ لے کر ہی دینی خدمت کرنے کا معمول رہا ہے، واللہ اعلم۔

فقہائے اسلام کی چند تصریحات

حضراتِ خلفائے راشدین اور صحابہ کے اسوہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے فقہاء نے بھی واضح طور پر یہی فیصلہ فرمایا ہے کہ تعلیمِ قرآن وتدریس نیز قضاء وفتویٰ نویسی اور دیگر دینی خدمات پر معلّمین ومدرسین کے لئے وظائف لینا بالکل درست اور جائز ہے، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ ضرورت نہ ہوتب بھی وظیفہ لے کر ہی کام کرے یعنی مستغنی اور مالدار معلم کو بھی وظیفہ لینے کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ ایسے لوگ عام مسلمانوں کی دینی خدمات میں مصروف ہیں، لہٰذا ایسے لوگوں کا نفقہ بھی عامۃ المسلمین پر واجب ہوگا، جو بیت المال سے وصول کیا جائے گا، اسی لئے بیت المال سے ان کو وظیفہ لینے کا حق ہوتا ہے، چنانچہ جب تک اسلامی حکومتوں میں بیت المال کا شرعی نظام قائم تھا، حکام کی طرف سے اساتذہ ومعلمین کو وظائف دیئے جاتے تھے، اور ان معلمین کے وظائف کے استحقاق کی علت فقہاء نے یہی لکھی ہے کہ انہوں نے تعلیم دین اور تعلیم قرآن وغیرہ کے لئے اپنے

کو فارغ کرلیا تھا، اور تعلیم دین کے ساتھ معاش کے دوسرے طریقوں تجارت وغیرہ کو اختیار کرنا دشوار تر ہوتا ہے، فقہائے کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے، چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:

(۱) شمس الائمۃ سرخسیؒ اموالِ بیت المال کے مصارف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فهذا النوع مصروف إلى نوائب المسلمين ومنها إعطاء المقاتلة كفايتهم وكفاية عيالهم لأنهم فرّغوا أنفسهم للجهاد ودفع شر المشركين عن المسلمين فيعطون الكفاية من أموالهم......ومنه أرزاق القضاء والمفتين والمحتسبين والمعلّمين وكلّ من فرّغ نفسه لعمل من أعمال المسلمين على وجه الحسبة فكفايته فى هذا النوع من المال.

(مبسوط سرخسی ص۱۸/۳، باب ما يوضع فيه الخمس)

(۲) شارح ہدایہ علامہ ابن الہمامؒ فتح القدیر میں تحریر فرماتے ہیں:

ويعطىٰ قضاة المسلمين وعمالهم وعلمائهم منه ما يكفيهم فإنه تجب نفقتهم عليهم فلو لم يكفوها من بيت المال اشتغلوا بالكسب وتركوا الاستعداد للدفع......وزاد المصنف في التجنيس أنه يعطىٰ أيضاً للمعلمين والمتعلمين وبهذا تدخل طلبة العلم. (فتح القدیر ص۳۰۷، ج۵)

(۳) علامہ ابن نجیمؒ البحر الرائق میں تحریر فرماتے ہیں:

وفى المحيط أن هذا النوع يصرف إلى أرزاق الولاة وأعوانهم وأرزاق القضاة والمفتين والمحتسبين والمسلمين وكل من تقلد شيئاً من أمور المسلمين وإلى ما فيه صلاح المسلمين.

سئل على الرازي عن بيت المال هل للأغنياء فيه نصيب؟ قال لا إلا أن يكون عاملاً أو قاضياً وليس للفقهاء فيه نصيب إلا فقيه فرّغ نفسه لتعليم الناس الفقه والقرآن.

وفى القنية من كتاب الوقف كان ابوبكرؓ يسوى فى العطاء من بيت المال، وكان عمرؓ يعطيهم على قدر الحاجة، والفقه والفضل والأخذ بما فعله عمرؓ فى زماننا أحسن فتعتبر الأمور الثلاثة. (البحر الرائق ص۱۱۸، ج۵)

(۴) ويصرف الخراج والجزية .....فى مصالح المسلمين كسد الثور وبناء القناطير والجسور وكفاية العلماء والمدرسين والمفتين اى وما يكفى المفسرين والمحدثين والمفتين والقضاة والعمال.

(بدر المتقی فی شرح الملتقیٰ علی ہامش مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر ص۶۷۸، ج۱)

معلمین ومدرّسین کے لئے تجارت کرنے کی اجازت کیوں نہیں؟

اوران کا نفقہ کن لوگوں پر واجب ہے؟ حضرت تھانویؒ کی چند تصریحات

دینی خدمات پر معاوضہ لینے کے متعلق خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کا جو معمول رہا اور فقہاء کرام نے اس سلسلہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے ٹھیک اُسی کے مطابق حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی تحریر فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

(۱) ''قرآن شریف مسلمانوں کی مشترک جائیداد ہے، اس لئے اس کی حفاظت بھی سب کو کرنا چاہئے، کچھ افراد ایسے بھی ہونا چاہئے کہ وہ محض خادمِ قوم ہوں، کیونکہ اگر سب کے سب تحصیلِ معاش ہی میں پڑ جائیں تو دین کا سلسلہ آگے نہیں چل سکتا، دین کے کام میں اگر کوئی بھی نہیں چلے تو یہ کام بند ہو جائے، لہٰذا ضروری ہے کہ ایک جماعت محض خادمانِ دین کی ہو کہ یہ لوگ اس کے سوا اور کوئی کام نہ کریں۔

تو یہ لوگ (یعنی اہلِ علم واہلِ مدارس) عوام اہلِ اسلام کی ضرورتوں میں محبوس ہیں، اور قاعدہ فقہیہ ہے کہ جو شخص کسی کی ضرورتوں میں محبوس

ہواس کا نان ونفقہ اسی شخص کے ذمہ ہوتا ہے، چنانچہ اسی بناء پر زوجہ کا نفقہ شوہر پر، اور قاضی کا نفقہ بیت المال میں، اور شاہد کا نفقہ من لہ الشہادۃ پر ہوتا ہے، پس علماء مسلمانوں کے مذہبی کام میں محبوس ہیں، اوران کے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں، روزمرہ کی جزئیات میں ان کو مذہبی حکم بتاتے ہیں، اور یہ شغل ایسا ہے کہ اس کے ساتھ دوسرا کام نہیں ہوسکتا، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ دوسرے کام میں جولوگ لگے ہیں ان سے یہ کام نہیں ہوتا توان کا نان ونفقہ بھی عام مسلمانوں کے ذمہ واجب ہوگا۔ (دعوات عبدیت ص۱۴۲، ج۵، وص۱۷۹، ج۶)

(۲) جولوگ علمِ دین کی تعلیم وتعلم میں لگے ہوئے ہیں وہ سب مسلمانوں کی طرف سے فرضِ کفایہ کوادا کررہے ہیں، اگر یہ لوگ پڑھنا (اور پڑھانا) چھوڑ دیں تو پھر یہ کام ہر شخص پر فرض ہوجائے اور اگر کسی نے بھی اس کام کوانجام نہ دیا تو سب گنہگار ہوں گے، لوگوں کوایسے مدارس کے مہتممین کا شکرادا کرنا چاہئے کہ انہوں نے اس فرضِ کفایہ سے سب کوسبکدوش کررکھا ہے، پس یہ تو ثابت ہوگیا کہ جولوگ علمِ دین میں مشغول ہیں وہ آپ ہی کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اور تجربہ ومشاہدے سے یہ ثابت ہے کہ علمِ دین کے ساتھ کسبِ معاش کا کام نہیں ہوسکتا، اوراگر کوئی ایسا کرنا بھی چاہئے تواس کوعلم کامل طور پر حاصل نہ ہوگا، ایک آدمی ایک زمانہ میں ایسے دوکام نہیں کرسکتا، جن کے لئے پورے انہماک کی ضرورت ہو۔

اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ ملایئے کہ شریعت کا قانون ہے کہ جوشخص کسی کے کام میں محبوس ہو، اس کا نفقہ اسی کے ذمہ واجب ہے، جس کے کام میں وہ محبوس ہے، بیت المال سے ملنا گویا مسلمانوں کے پاس سے ملنا ہے، اسی قاعدہ سے اہلِ علم کا نفقہ سب مسلمانوں کے ذمہ ہے، ان کوخود ان کی خدمت کرنا چاہئے، اگر ہم خدمت نہ کریں گے تواس سے یہ سمجھا جائے گا کہ ہمارے نزدیک تعلیم وتعلم کی کچھ وقعت نہیں۔

(التبلیغ ص۲۳۸، ج۲۱)

(۳) جس وقت تک بیت المال منتظم تھا، بیت المال سے وصول ہوجانا عام مسلمانوں کے وصول ہوجانے کی صورت تھی، چنانچہ فقہاء نے قضاۃ وعلماء ومفتیین واماثلھم کی کفالت کا بیت المال میں سے ہونا تصریحاً لکھا ہے، اور جب سے بیت المال منتظم نہیں رہا اب اس کی صورت صرف یہی ہے کہ سب مسلمان متفق ومجتمع ہوکر تھوڑا تھوڑا سب ان حضرات کی خدمت بطور کفالت کریں، خواہ مدرسہ کی شکل میں، جس میں تنخواہ اور وظیفے مقرر ہوتے ہیں، خواہ توکل کی صورت میں جن میں کوئی مقدار معین نہیں، جب اس کا انتظام قوم پر واجب ہے تو اگر ان کی خدمت میں کوتاہی کریں گے تو قیامت کے دن ان سے باز پرس ہوگی۔ (اصلاح انقلاب طبع جدید ص۱۹۲، ج۲)

دینی خدمت کرنے والے علماء کودنیوی معاش میں مشغول ہونے کی اجازت کیوں نہیں؟

شرعی دلیل قرآن پاک سے

قران مجید میں موجود ہے: لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْباً فِيْ الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ إِلْحَافاً. (سورہ بقرہ پ۳)

ترجمہ: صدقات اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہوگئے ہوں اللہ کی راہ میں یعنی دین کی خدمت میں، اوراسی وجہ سے وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اور ناواقف ان کو مالدار سمجھتے ہیں، ان کے سوال سے بچنے کی وجہ سے، ان کوتم ان کی علامتوں سے پہچان سکتے ہو۔ (بیان القرآن)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فائدہ: جاننا چاہئے کہ ہمارے ملک میں اس آیت کے مصداق سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جوعلومِ دینیہ کی اشاعت میں مشغول ہیں، پس اس بنا پر سب سے اچھا مصرف (علماء واہلِ مدارس اور) طالب علم ٹھہرے، اوران پر جوبعض ناتجربہ کاروں کا یہ طعن ہے کہ ان سے کمایا نہیں جاتا، اس کا جواب قرآن میں دے دیا گیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص ایسے دوکام نہیں کرسکتا جن میں سے ایک میں یا دونوں میں پوری

مشغولی کی ضرورت ہو، اور جس کو علمِ دین کا کچھ مذاق ہوگا وہ مشاہدہ سے سمجھ سکتا ہے کہ اس میں غایت مشغولی وانہاک کی حاجت ہے، اس لئے اس کے ساتھ اکتسابِ مال کا شغل (یعنی کسب اور تجارت کا شغل) جمع نہیں ہوسکتا، اور اس کے کرنے سے علمِ دین کی خدمت ناتمام رہ جاتی ہے، چنانچہ ہزاروں نظائر پیشِ نظر ہیں۔ (بیان القرآن سورہ بقرہ پ۳، ص۱۶۴، ج۱)

فائدہ: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ دوسرے موقعوں پرتحریر فرماتے ہیں کہ (آیت مذکورہ) سے ایک قاعدہ مفہوم ہوتا ہے جس کو فقہاء نے سمجھ کر اس پر بہت سے فروع متفرع کئے ہیں، وہ قاعدہ یہ ہے کہ:

''جو شخص کسی کی منفعت کے لئے محبوس ہو اس کا نفقہ اس پر واجب ہوتا ہے، نفقۂ زوجہ کا زوج پر، قضاۃ وولاۃ کا نفقہ بیت المال میں، جس کا حاصل وجوبِ جمع مسلمین پر ہے، اسی قاعدہ پر متفرع ہے''

پس جواب کی تقریر یہ ہوئی کہ جب یہ جماعت (یعنی اہل علم واہل مدارس) خدمتِ دین کے لئے جو مدلول ہے **فی سبیل اللہ** کا، محبوس اور وقف ہے جو مدلول ہے **اُحْصِرُوْا** کا، تو ان کے حوائج کی کفایت کی بقدر، جو مدلول ہے **فقراء** کا، ان کا حق مسلمانوں کے ذمہ واجب ہے، جو مدلول ہے لامِ استحقاق کا، تو جمہور مسلمین کو چاہئے کہ ان کے مصارف کی کفالت کریں، خواہ تعیّن کے ساتھ جیسے مدرسین وواعظین کی تنخواہ، خواہ بلا تعین جیسے متوکلین کی خدمت۔

فائدہ: (اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا) کہ ایسی جماعت کو (جو دینی تعلیم کی خدمت میں مشغول ہو) ذرائع تحصیلِ معاش (یعنی تجارت وغیرہ) میں بالکل مشغول نہ ہونا چاہئے، **لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْباً فِیْ الْأَرْضِ** اس پر دلالت کر رہا ہے۔

اور اس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا جو عوام الناس علماء پر دنیوی معاش میں اپاہج ہونے کا الزام دیتے ہیں، اور ثابت ہوگیا کہ بایں معنیٰ اپاہج ہونا ضروری ہے، اور راز اس میں یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام نہیں ہوا کرتے، خصوصاً جب کہ ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول ہونے کی ضرورت ہو، بالید، یا باللسان، یا بالقلب، اور خدمت دین ایسا ہی کام ہے، اور تدریسِ علوم دینیہ یہ ذرائع معاش میں داخل نہیں، بلکہ وہ تنخواہ خدمتِ دین میں محبوس ہونے کی وجہ سے ہے۔ (حقوق العلم ص۱۴، ۱۵، مطبوعہ تھانہ بھون، مصنفہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ)

تنبیہ: حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

جب خداتعالیٰ ہی فرماتے ہیں: **لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْباً فِیْ الْأَرْضِ** کہ ان میں طاقت ہی نہیں کہ دوسرے کام کریں، طاقت سے مراد شرعی طاقت (یعنی یہ) کہ ان کو اجازت نہیں کہ یہ دوسرے کام میں لگیں، اس مسئلہ کو میں ایک مثال دے کر واضح کرتا ہوں، ہمارے اطراف میں ایک صاحب نے جو سرکاری ملازم تھے، ایک مطبع کرلیا (یعنی پریس کھول لیا) شدہ شدہ حکام کو اس کی خبر ہوئی تو ان کے نام ایک پروانہ آیا کہ یا تو نوکری سے استعفیٰ دے دو، ورنہ مطبع بند کردو، آخر اس حکم کی کیا وجہ ہے؟ وجہ یہی ہے کہ مطبع کرنے کی صورت میں وہ نوکری کا کام پورے طور پرانجام نہیں دے سکتے تھے۔ (دعواتِ عبدیت، فضائل علم ص۴۰، ج۷)

تنخواہ لئے بغیر پڑھانے کا خیال نفس اور شیطان کا دھوکہ ہے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

ایک مولوی صاحب کو جوش اٹھا کہ (مدرسہ کی تنخواہ اور) نوکری چھوڑ دوں، میں نے پوچھا کہ نوکری چھوڑ کر علمِ دین کی خدمت بھی کروگے یا نہیں؟ کہنے لگے حسبۃً للہ کروں گا (یعنی بغیر تنخواہ کے فی سبیل اللہ پڑھاؤں گا) میں نے کہا کہ میں پیشن گوئی کرتا ہوں کہ آپ سے یہ نہیں ہوگا، سوچ کر بولے کہ جی ہاں ہے تو صحیح، حضرت نے فرمایا کہ نوکری وتنخواہ کی وجہ سے تو کچھ کام کرتے بھی ہیں، کچھ لوگوں کا خیال ہوتا ہے، کچھ خیانت وغیرہ سے ڈرتے ہیں، اور نوکری چھوڑنے کے بعد تو کوئی بھی نہیں کرتا، شاید ہی کوئی ایسا ہو۔ (حسن العزیز ص۲۶۵، ج۲)

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

تھوڑے روز ہوئے ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے ان کے نفس نے یہ تجویز کیا تھا کہ نوکری (اور تنخواہ) چھوڑ کر اللہ کے واسطہ پڑھائیں، اس لئے کہ تنخواہ لینے سے خلوص نہیں رہتا، میں نے ان سے کہا یہ شیطانی دھوکہ ہے، شیطان نے دیکھا کہ یہ دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں، ان سے یہ کام کسی تدبیر سے چھڑانا چاہئے، تو اگر یہ کہتا کہ پڑھانا چھوڑ دو، تو اس کی ہرگز نہیں چلتی، اس لئے اس کی وہ صورت تجویز کی جو دینداری کے رنگ میں ہے کہ اس میں خلوص نہیں ہے، نوکری چھوڑ کر پڑھاؤ، تو سمجھ لو کہ ابھی تو تنخواہ کی وجہ سے پابندی سے کام بھی ہورہا ہے، اور اگر نوکوی چھوڑ دوگے (یعنی بلا تنخواہ پڑھاؤ گے) تو پابندی تو ہوگی نہیں، رفتہ رفتہ پڑھانا بھی چھوٹ جائے گا، اور شیطان کامیاب ہوجائے گا، اس لئے نوکری (یعنی تنخواہ لینا) ہرگز مت چھوڑو۔ (دعوات عبدیت ص ۳۱، ج ۳، وعظ ذمّ ہویٰ)

غنی اور مالدار عالم کو بھی تنخواہ لے کر ہی پڑھانا چاہئے

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

میری رائے تو یہ ہے کہ اگر عالم امیر (اور مالدار) ہو اور تنخواہ ملنے لگے تب بھی اس کو چاہئے کہ تنخواہ لے کر پڑھائے، اگر ایسا ہی امارت (اور مالداری) کا جوش اٹھے، وہ تنخواہ پھر مدرسہ میں دے دے، مگر لے ضرور، تاکہ پابندی سے کام ہوتا رہے۔

ہمارے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر قاضی امیر کبیر ہو تو اس کو بھی تنخواہ لینا چاہئے، اور وجہ اس کی یہ (بھی) ہے کہ اگر کوئی قاضی تنخواہ نہ لے اور دس برس تک وہ قاضی رہا، اس کے بعد کوئی غریب قاضی ہو کر آیا تو اب تنخواہ کا اجراء مشکل ہوگا، سبحان اللہ، فقہاء کا کیا فہم ہے، یہ حضرات حقائق شناس تھے۔ (دعوات عبدیت وعظ ذمّ ہویٰ ص ۳۱، ج ۳)

ایک تجربہ اور مشاہدہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

ایک روز میں راستہ میں جارہا تھا، ایک بڑھیا اپنے دروازے میں جھانک رہی تھی، مجھ کو دیکھ کر بولی بیٹا! یہاں آنا، میں گیا تو بولی ایک مسئلہ بتادو، میں نے مسئلہ بتایا پھر کہنے لگی میں نے اس سے یعنی لکڑیوں والے مولوی صاحب سے بھی پوچھا تھا انہوں نے بھی تمہارے موافق بتلایا، مگر مجھ کو یقین نہ ہوا کہ شاید اپنے مطلب کے لئے کہتے ہوں، اب تمہارے بتلانے سے یقین ہوا، میں نے بڑی بی کو سمجھایا کہ علماء سے ایسی بدگمانی جائز نہیں، یہ ہے علماء کے دنیا میں مشغول ہونے کا نتیجہ کہ مسائل میں ان کا اعتبار نہیں رہتا، ان کے دنیا میں مشغول ہونے سے خرابی یہ ہے کہ خود تم کو ان کے فتووں کا، ان کے وعظوں کا اعتبار نہ ہوگا۔ (التبلیغ ص ۶۹)

تنخواہ لے کر پڑھانا بھی واقعی دینی خدمت ہے اور تنخواہ لے کر پڑھانا تجارت سے بھی افضل ہے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کی تصریح

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

”میرے نزدیک (تمام مکاسب میں) تجارت افضل ہے، وہ بحیثیت پیشہ کے ہے، اس لئے کہ تجارت میں آدمی اپنے اوقات کا مالک ہوتا ہے، تعلیم وتعلم تبلیغ وافتاء وغیرہ کی خدمت بھی کرسکتا ہے، لہٰذا اگر اجارہ دینی کاموں کے لئے ہو تو وہ تجارت سے بھی افضل ہے اس لئے کہ وہ واقعی دین کا کام ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہی کام مقصود ہو اور تنخواہ بدرجہ مجبوری ہو، میرے اکابر اکابرِ دیوبند کا زیادہ معاملہ اسی کا رہا، اور اس کا مدار اس پر ہے کہ کام کو اصل سمجھے اور تنخواہ کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ..... یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر میں نے اجارہ تعلیم کو سب انواع سے افضل لکھا ہے“ (فضائل تجارت ص ۵۲)

جو مدرّس تنخواہ لئے بغیر پڑھانے کو کہے اس کو مدرّس نہ رکھا جائے!

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا فیصلہ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

’’میرا تو کئی سال سے یہ معمول ہے کہ اہلِ مدارس کو مشورہ دیتا ہوں کہ بغیر تنخواہ کے مدرّس نہ رکھا جائے، اور اپنا ذاتی تجربہ اپنے مدرسہ کا یہ ہے کہ ابتداء میں مَیں نے مظاہر علوم میں معین المدرّس کا درجہ شروع کیا تھا، جس کو ایک دو سبق مدرسہ کے اور بقیہ اوقات میں اپنا کوئی تجارتی کام کرنے کا مشورہ دیتا تھا، مگر ایک ہی سال بعد ان کی توجہ پڑھانے کی طرف کم ہوگئی اور تجارتی کام میں لگ گئے، اور شدہ شدہ دینی کام چھوٹ گیا، اور بے تنخواہ مدرس جس بے توجہی سے کام کرتے ہیں، تنخواہ دار نہیں کرتا، اور اسلاف کے متعلق جو مشہور ہے کہ وہ تعلیمی کام کے ساتھ ساتھ کچھ تجارت وغیرہ بھی کرتے تھے تو ان پر ہمیں اپنے آپ کو قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کا توکل اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بقدرِ ضرورت دنیا میں مشغول ہونا ان کو دینی کام سے ہٹا کر دنیا میں منہمک نہیں کر دیتا تھا، بلکہ وہ تجارت کو دینی تعلیم کے تابع رکھتے تھے، اور محض رزقِ کفاف کے لئے تجارت کرتے تھے، لیکن اِس زمانہ کا حال یہ ہے کہ اگر دینی تعلیم وتدریس کے ساتھ تجارت وغیرہ کمائی کے ذرائع بھی شروع کر دیئے جائیں تو اپنی دینی کمزوری اور توکل کی کمی کی وجہ سے ساری توجہ دنیا کی طرف ہو جاتی ہے، اور تعلیم وتدریس سے طبیعت بالکل علٰحدہ ہو جاتی ہے، اس تجربہ تلخ کی وجہ سے میں نے ہمیشہ مدارس میں صنعت وحرفت کو داخل کرنے سے اختلاف کیا کہ جو کچھ دل یا بے دلی سے یہ طلباء ومدرسین تعلیمی کام کر رہے ہیں، صنعت وحرفت کے آجانے کے بعد بالکل ہی ہاتھ سے جاتے رہیں گے‘‘ (فضائلِ تجارت ۵۲، ۵۸)

اسی بات کو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ’’اوجز المسالک‘‘ شرح مؤطا مالک کے مقدمہ میں بھی تحریر فرمایا ہے:

إن مـا أكثـر لا يأخذون الأجر في زماننا لا يهتمون بالدروس ويضيعونها ويعطلون أوقاتهم وأوقات الطلبة ظنا منهم أنهم على أمن من النكير عليهم فهذا أشد من الأول ولمثل هولاء فالأجرة متعين عليهم. (مقدمہ اوجز المسالک شرح مؤطا مالک ص ۷۷)

تنخواہ لینے کے متعلق اکابرِ علماء دیوبند وسہارنپور کا معمول

یہی وجہ ہے کہ ہمارے تمام اکابر علماء دیوبند وسہارنپور کا ہمیشہ سے تنخواہ لینے کا معمول رہا ہے، اور انہوں نے ہمیشہ تنخواہ لے کر ہی تعلیم وتدریس کا کام کیا ہے، جیسا کہ مندرجہ ذیل تفصیل سے معلوم ہوتا ہے، چند اکابر کے معمولات پیشِ خدمت ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

(۱) میرے حضرت (یعنی حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری شارح ابوداؤد) کی آخری تنخواہ مظاہر علوم میں چالیس روپے تھی۔

(۲) اور حضرت شیخ الہندؒ کی آخری تنخواہ دار العلوم میں پچاس روپے تھی، ان دونوں کے متعلق جب بھی ممبران اور سرپرستان کی طرف سے ترقی تجویز ہوئی تو دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ یہ کہہ کر ترقی سے انکار کر دیا کرتے تھے کہ ہماری حیثیت سے یہ بھی زائد ہے۔

(۳) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ابتداء میں سہارنپور میں دس روپے تنخواہ پر بچوں کو پڑھانے کے لئے ملازمت کی۔

(۴) اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے متعلق بھی گزر چکا کہ کچھ دنوں حدیث پڑھانے پر اور تصحیح کتب پر تنخواہ لی۔ (فضائل تجارت ص ۵۳، ۵۹)

(۵) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا کانپور کے مدرسہ فیضِ عام میں ۲۵ روپے تنخواہ پر تقرر رہا۔ (اشرف السوانح ص ۳۷، ج ۱)

(۶) مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپور نے مولانا سخاوت احمد صاحب انبہٹوی کو جو پہلے انبہٹہ میں پڑھایا کرتے تھے بمشاہرہ تیرہ روپے ماہانہ مدرس مقرر فرمایا۔ (تاریخِ مظاہر ص ۵، ج ۱)

(۷) شوال ۱۲۳۸ھ سے حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتویؒ کو بمشاہرہ تیس روپے ماہانہ پر مدرس اول مقرر فرمایا۔

(تاریخ مظاہر ص ۵، ج ا، مظاہر علوم کے بنیادی مقاصد اکابر مظاہر علوم کے رہنما خطوط کی روشنی میں)

(۸) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے متعلق مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

دارالعلوم دیوبند میں جب بحیثیت مدرّس آپ کا تقرر ہوا تو ابتدائی تنخواہ ۱۵/روپیہ ماہانہ مقرر ہوئی، اور جب ۱۳۶۲ھ میں آپ نے دارالعلوم سے استعفیٰ دیا تو اس وقت ترقی ہوتے ہوتے ۶۵/روپے ماہانہ تک پہنچے تھے۔ (میرے والد میرے شیخ ص ۱۳)

(۹) حضرت مفتی محمود صاحب گنگوہیؒ کا مظاہر علوم سہارنپور میں ۱۳۵۱ھ میں دس روپے ماہوار مشاہرہ پر تقرر ہوا۔ (حیات محمود ص ۲۴۷)

(۱۰) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا تقرر ندوہ میں ۱۹۳۴ء میں ۴۰ روپے میں ہوا۔ (کاروانِ زندگی ص ۱۳۹، ج ا)

اکابر علماء سہارنپور کا قلیل تنخواہ لے کر پڑھانا ان کا امتیازی وصف تھا

اکابر علماء مظاہر علوم سہارنپور کا ہمیشہ معمول رہا وہ تنخواہ لے کر ہی پڑھایا کرتے تھے، بلکہ ان کے خصوصی امتیاز اور اوصاف میں یہ بات شمار کی گئی ہے کہ وہ قلیل تنخواہ پر پڑھاتے تھے نہ کہ یہ کہ بغیر تنخواہ کے پڑھاتے تھے، چنانچہ ''علماء مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات'' کے مرتب تحریر فرماتے ہیں:

''مظاہر علوم کی ایک اور خصوصیت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ اس کے ذمہ دار حضراتِ اساتذہ اور انتظامی افراد نے ہمیشہ معمولی تنخواہوں پر کام کیا، اور اصل معاوضہ و حقیقی اجر اللہ رب العزت سے لینے کے متمنی رہے..... مظاہر علوم کی یہ خصوصیت دورِ اول سے ہی اس کے شاملِ حال رہی ہے، یہاں انتہائی اجمال کے ساتھ ایسے چند حضرات کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

(۱) مولانا احمد حسن صاحب استاذ دوم کا تقرر مظاہر علوم میں ۱۲۸۷ھ میں ۱۵ روپے مشاہرہ پر ہوا۔

(۲) مولانا حافظ قمر الدین صاحب نور اللہ مرقدہ کا تقرر ۱۲۸۷ھ میں ۳ روپے مشاہرہ پر ہوا، آپ نے ۴۷ سال دین کی خدمت کی آپ کی تنخواہ کی آخری حد ۲۰ روپے تھی۔

(۳) مولانا عنایت الٰہی صاحب کا تقرر مظاہر علوم میں ۱۲۸۹ھ میں ہو کر ۱۳۴۷ھ میں وصال پر ختم ہوا، لیکن تنخواہ وہی چند روپے رہی، ابتدائی تقرر کے وقت آپ کا مشاہرہ ۵ روپے اور آخری مشاہرہ ۴۵ روپے ہوا۔

(۴) مولانا احمد علی صاحب مرادآبادی مدرس سوم کا تقرر ۱۲۹۷ھ میں ۱۰ روپے مشاہرہ پر ہوا۔

(۵) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نور اللہ مرقدہ کی تنخواہ مظاہر علوم میں ۴۰ روپے تھی۔

(۶) مولانا عبداللطیف صاحب سابق استاذِ حدیث و مہتمم مدرسہ کا تقرر ۱۳۲۳ھ میں ۱۰ روپے مشاہرہ پر ہوا، اور ۱۳۷۳ھ میں آپ کا وصال ہوا، آپ کی آخری تنخواہ ۱۶۱ روپے تھی۔

(۷) حضرت اقدس شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا تقرر ۱۳۳۵ھ میں ۱۵ روپے مشاہرہ پر ہوا۔

(۸) مولانا الحاج الشاہ محمد اسعد اللہ صاحب آپ کا باضابطہ تقرر ۱۳۳۸ھ میں ۱۵ روپے مشاہرہ پر ہوا۔

(علماء مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات ص ۲۰۶ تا ۲۰۹)

(۹) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحبؒ کا ۱۳۸۱ھ میں معین مدرّس کے عہدہ پر ۷/روپے ماہانہ پر تقرر ہوا، اور ۱۳۸۳ھ میں ۳۰/روپے خشک (یعنی بلا طعام) پر تقرر رہوا۔ (شیخ یونسؒ کی کہانی خود ان کی زبانی، ماخوذ از: ارمغان اگست ۲۰۱۷ء، ص ۱۱)

(۱۰) مولانا صدیق احمد صاحب باندویؒ کا ۱۹۴۶ء میں مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں تقرر ہوا اور آپ کی تنخواہ ۲۶ روپے تھی۔ (تذکرۃ الصدیق ص ۲۵۰، ج ا)

خلاصۂ کلام

خلفائے راشدین ودیگر صحابہ کے تعامل اور فقہائے اسلام کے فیصلے نیز اکابر علماء دیوبند وسہارنپور کی مذکورہ بالا تصریحات اور اسلاف کے معمولات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے خود ہی فیصلہ کرنا چاہئے کہ دینی مدارس کے علماء اصحابِ تعلیم وتدریس کو مستقلاً تجارت میں مشغول ہونا چاہئے یا نہیں، اور بغیر تنخواہ کے پڑھانے کے کیا فوائد یا کیا نقصانات سامنے آسکتے ہیں، اور یہ کہنا جیسا کہ مولانا سعد صاحب نے فرمایا ہے کہ علماء کو اپنے اندر جامعیت کی شان پیدا کرنا چاہئے جو تین کاموں سے پیدا ہوتی ہے، دعوت، تعلیم، تجارت، ورنہ علماء کے اندر ایسی جامعیت کا نہ ہونا نکمّا پن ہے، یہ بات کس حد تک درست ہوسکتی ہے؟ اہلِ علم کے لئے جامعیت کا یہ معیار کس نے مقرر کیا، جس کو اتنی قوت کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے، اپنے اکابر واسلاف تو تنخواہ لے کر ہی پڑھاتے تھے، اور تعلیم وتدریس کے ساتھ تجارت نہیں کرتے تھے، کیا ان کے اندر جامعیت نہیں پائی جاتی تھی، اور وہ سب نکمّے تھے؟ حکیم الامت حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ، حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا صدیق احمد باندویؒ اور دیگر ہمارے اکابر واسلاف جنہوں نے اپنی پوری زندگیاں تعلیم وتدریس میں صرف کردیں، کیا ان کے اندر جامعیت نہیں پائی جاتی تھی، اس بنا پر کہ وہ تجارت نہیں کرتے تھے، کیا وہ سب بھی نعوذ باللہ نکمّے تھے؟ اس طرح کے بیانات سے سامعین پر کیا اثرات پڑتے ہیں، اور اہلِ علم واصحاب مدارس سے کس قدر دوری اور بدگمانی کی راہ ہموار ہوتی ہے، اس قسم کی باتوں سے مولانا امت کو کس رُخ پر لے جارہے ہیں، کیا دعوت وتبلیغ کے اکابر واسلاف حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کا یہی فکر اور یہی نہج تھا؟ بلکہ خود حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ تو باتنخواہ ہی پڑھاتے تھے اور تجارت نہیں کیا کرتے تھے، کیا ان کو بھی نکمّا کہا جائے گا؟ موجودہ وقت میں دعوت وتبلیغ کے مختلف مراکز اور خود مرکز نظام الدین میں کتنے اصحاب علم وفضل ہیں جو تدریس اور تجارت نہیں کرتے، کیا یہ کہنا پسند کیا جائے گا کہ ان سب کے اندر جامعیت نہیں لہٰذا یہ سب بھی نکمّے ہیں، پھر اکابر واسلاف کے تعلق سے ایسی بات کیوں کہی جاتی ہے، ایسے استدلالات اور ایسے مجتہدات سے امت کو کون سا پیغام پہنچایا جارہا ہے؟ پھر عام مجمعوں میں یہ باتیں بیان کی جاتی ہیں، جو لوگ ان کے معتقد اور ان پر فدا ہیں ان کی باتوں کو نقل کرتے اور چلاتے ہیں، اس نوع کے مضامین بیان کرنے سے امت میں کس قدر حدود سے تعدی اور بدگمانی کی باتیں چل پڑی ہیں، اس کا تدارک کس طرح ہونا چاہئے، اہلِ علم واصحاب فضل وکمال کے لئے یہ بات بہت قابلِ غور اور باعث تشویش ہے کہ اس کی اصلاح کی کیا کوشش ہونی چاہئے، اور اس کے سدِّ باب کی کیا تدبیر کرنی چاہئے۔

مستدلّین کے استدلالات کا علمی وتحقیقی جائزہ، غلط فہمی کہاں سے ہوئی

ماقبل میں ذکر کردہ تفصیلات سے قرآن وحدیث، سیرت نبی ﷺ اور تعامل صحابہؓ، فقہاء ومحدثین کی تصریحات نیز اسلاف واکابرینؒ کے تعامل سے اچھی طرح واضح ہوچکا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور عمل علی الصدقہ اور علوم دینیہ وشرعیہ کی خدمت انجام دینے پر وظیفہ اور تنخواہ کا لین دین بلا کراہت جائز ہے نہ یہ حق تعالیٰ کی رضا اور اجر وثواب کے منافی ہے نہ ہی زہد وتوکل اور تقویٰ کے خلاف ہے، اگر ایسا ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ واسلاف اور اکابر سے اس کا لین دین ثابت نہ ہوتا، سب سے زیادہ اس سے اجتناب کرنے والے خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام ہوتے لیکن دینی خدمات پر مشاہرہ اور تنخواہ لینے دینے کا صحابہ کرام کا بھی معمول رہا ہے، ہمارے اکابر علمائے ہند کا عمل بھی اسی کے مطابق رہا، اب ان سب دلائل شرعیہ اور تعامل امت کے خلاف اس بات پر زور دینا کہ دینی تعلیم بلا تنخواہ کے ہونا چاہئے کیونکہ اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہوسکتے، **ما أسئلکم علیہ من أجر**، وظیفہ اور تنخواہ لے کر دینی خدمت کرنا یہ دین نہیں بلکہ یہ تو ضرورت کو پورا کرنا ہے، دینی خدمت تو یہ ہے کہ بلا معاضہ خدمت کی جائے اور ضروریات زندگی کے لئے تجارت کی جائے، علمائے کرام کو تعلیم وتبلیغ اور تجارت تینوں کو جمع کرنا چاہئے ورنہ ان کے اندر نکما پن شمار ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

یہ فکراور ذہن سازی بڑی خطرناک اور انتہائی نادانی وجہالت پر مبنی ہے، اور درحقیقت تمام صحابہ واسلاف واکابر اور مجتہدین امت پر طعن وتشنیع اور بدگمانی کا دروازہ کھولنا ہے کہ ان حضرات نے گویا دین کی کوئی خدمت نہیں کی، کیونکہ یہ حضرات تو تنخواہ اور وظیفہ لے کر دینی خدمت کرنے کو اجروثواب کے منافی نہ سمجھتے تھے، اس لئے لیا کرتے تھے۔

اس فکراور نظریہ کے حاملین کے پاس کوئی قابل ذکر شرعی دلیل یا معقول وجہ نہیں، محض بے عقلی وناسمجھی کی باتیں بیان کرتے اور اس کو شرعی دلیل کا درجہ دیتے ہیں، جو منصب ائمہ مجتہدین کا ہے اپنے کو مجتہد سمجھ کر حدیثوں اور صحابہ کرام کے واقعات سے غلط استدلال کرتے ہیں، اور یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کو اصولِ اجتہاد کی ہوا تک نہیں لگی، استنباط وقیاس سے ان کو کچھ سروکار نہیں، اس کوچے سے وہ بالکل ناواقف ہیں، لیکن حدیثوں کا اردو ترجمہ دیکھ کر اپنی خوش فہمی سے صحابہ وائمہ مجتہدین کے خلاف باتیں بیان کرکے امت کے ذہن کو گندہ کرتے ہیں، زیر بحث مسئلہ میں بھی ایسا ہی ہوا ہے، مسلم شریف اور مجمع الزوائد میں روایت موجود ہے جس کو حیاۃ الصحابہ میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے نقل فرمایا ہے، جس کا عنوان ہے: ''اجرت لے کر جہاد کرنا'' اور اس میں مندرجہ ذیل حدیث ذکر فرمائی ہے:

حدیث: حضرت عوف بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ نے ایک سریہ میں روانہ فرمایا، ایک آدمی نے کہا میں تمہارے ساتھ اس شرط پر چلتا ہوں کہ تم میرے لئے ایک حصہ مالِ غنیمت میں سے دو، پھر کہنے لگا خدا کی قسم مجھے کیا علم تم لوگوں کو غنیمت ملے یا نہ ملے، تم تو میرے لئے ایک معین حصہ مقرر کردو، میں نے اس کے لئے تین اشرفیاں مقرر کیں، پھر ہم لوگوں نے جہاد کیا اور مالِ غنیمت حاصل کیا، میں نے حضور ﷺ سے اس آدمی کے بارے میں دریافت کیا آپ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا میں اس کے لئے دنیا وآخرت میں سوائے ان تین دینار کے جو اس نے لئے اور کچھ نہیں پاتا۔ (مجمع الزوائد للہیثمی ص ۲۲۳، ج ۵، حیاۃ الصحابہ ص ۶۲۷، ج ۱)

حیاۃ الصحابہ میں اسی مضمون کی ایک حدیث یعلیٰ بن منیۃ کی بھی نقل کی ہے۔

مولانا سعد صاحب اور دوسرے بعض تبلیغی ذمہ دار اس نوع کی حدیثوں کو بیان فرماکر یہ استدلال کرتے ہیں کہ اجرت لے کر جہاد کرنے والے صاحب کے لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اُس شخص کو دنیا وآخرت میں سوائے تین دینار کے کچھ نہیں ملے گا، لیکن اس حدیث پاک سے علی الاطلاق یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں، جس کی وجوہات مندرجہ ذیل ہیں:

اس حدیث پاک میں سب سے پہلے تو قابل غور بات یہ ہے کہ اجرت یا تنخواہ لے کر جہاد کرنا علی الاطلاق اگر خلافِ شرع یا اجروثواب کے منافی ہوتا تو رسول اللہ ﷺ حضرت عوف بن مالکؓ اور حضرت یعلیٰ بن منیۃ پر فوراً نکیر فرماتے کہ تم کو اس طرح سے اجرت دے کر کسی سے جہاد نہ کرانا چاہئے تھا کیونکہ یہ غلط ہے، یا کم ازکم اجروثواب کے منافی ہے، اور غلط کام کی اعانت کرنا بھی غلط ہے، اگر واقعی یہ عمل یعنی اجرت لے کر جہاد کرنا شرعاً غلط یا اجروثواب کے منافی ہوتا تو صحابہ کرام ہرگز ایسا اقدام نہ کرتے اور رسول اللہ ﷺ اس پر ضرور نکیر فرماتے، صحابہ کا اس کام کو کرنا اور حضور پاک ﷺ کا اس پر نکیر نہ کرنا یہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہ تھی اور نہ ہی یہ اجروثواب کے منافی عمل ہے، فقہاء نے بھی اس کے جواز کی تصریح فرمائی ہے۔ (البحر الرائق ص ۷۳، ج ۵، کتاب السیر)

البتہ یہ بات جو آپ نے فرمائی کہ اس کو دنیا وآخرت میں سوائے ان تین دینار کے جو اس نے شرط کرکے لئے ہیں کچھ اور نہ ملے گا اس کا تعلق عدم خلوص یعنی اخلاص نہ ہونے سے ہے، نہ کہ اجرت کے لینے یا نہ لینے سے، مذکورہ واقعہ میں اس شخص کا طرزِ عمل اور یہ قول کہ: ''مجھے کیا علم تم لوگوں کو غنیمت ملے یا نہ ملے تم تو میرے لئے ایک معین حصہ مقرر کردو'' اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ اس شخص کا مقصود محض دنیا حاصل کرنا ہے اور یہ شخص جہاد میں مخلص نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس کے مخلص نہ ہونے اور دینار پرست ہونے کی وجہ سے یہ بات فرمائی کہ اس کو دنیا وآخرت میں اس کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

اس کی واضح مثال یہ ہے کہ مسلم شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ایک شہید

کو بلایا جائے گا اس سے حساب وکتاب اور سوال وجواب ہوگا وہ کہے گا کہ یا اللہ! تیرے دین کے خاطر ہم نے گردن کٹادی، خون بہادیا، جان کو قربان کردی، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، بیشک تو نے یہ کام کیا، لیکن اس واسطے کیا تاکہ تیری بہادری اور شجاعت کے چرچے ہوں، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

إن أول الناس يقضى يوم القيامة عليه، رجل أستشهد فأتى به فعرفه نعمه فعرفه، قال: فما عملت فيها؟ قال: قاتلت فيک حتیٰ استشهدت قال: كذبت ولكن قاتلت لأن يقال جرى فقد قيل، ثم أمر فسحب على وجهه حتیٰ ألقى في النار. (مسلم شریف، باب من قاتل للريا والسمعة استحق النار، حدیث۴۹۰۰)

یہاں ریاکار مجاہد کو جو دوزخ میں بھیجا گیا یہ کہہ کر نہیں کہ تو نے اجرت اور تنخواہ کیوں لی بلکہ اس لئے کہ تو جہاد کرنے میں مخلص نہ تھا، اللہ کی رضا کے خاطر تیرا جہاد نہ تھا، اور کسی شخص کے بارے میں خلوص یا عدم خلوص کا فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے، رسول اللہ ﷺ کو مذکورہ واقعہ میں معلوم ہوگیا تھا کہ یہ شخص جہاد میں بالکل مخلص نہیں، اس کا مقصد محض دینار حاصل کرنا ہے، اس لئے آپ نے یہ بات فرمادی، باقی کسی بھی شخص کے بارے میں کسی کو اس کے غیر مخلص ہونے کا فیصلہ کرنا یا متہم کرنا درست نہیں، لیکن قبولیت وعدم قبولیت اور اجر وثواب کا مدار ومعیار خلوص وعدمِ خلوص ہے نہ کہ تنخواہ کا لین دین، اور اس شرعی ضابطہ میں تعلیم وتدریس ہی کی تخصیص نہیں، بلکہ تبلیغ وتذکیر، بیعت وارشاد میں بھی اگر کوئی شخص غیر مخلص ہے اس سے قطع نظر کہ وہ اجرت لیتا ہے یا نہیں، عدمِ خلوص کی صورت میں وہ بھی مستحقِ نار ہوگا، مدرّس ہو یا مبلّغ، امیر ہو یا مامور، سب کا ایک حکم ہے، اور کسی فرد یا جماعت کے بارے میں بدگمانی کرنا یا ایسے مضامین بیان کرنا جس سے دوسروں کو بدگمانی کا موقع ملے ہرگز درست نہیں، ایسا کرنے والا یقیناً بدگمانیوں کے پیدا کرنے والوں کے گناہ کا مرتکب ہوگا، ہر شخص کو اولاً اپنی فکر کرنی چاہئے اور اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ وہ اپنی تدریسی یا دعوتی وتبلیغی کام میں کتنا مخلص اور متواضع ہے، الغرض مذکورہ بالا واقعہ سے جو حیاۃ الصحابہ میں مذکور ہے اس بات پر استدلال کرنا کہ تنخواہ لے کر پڑھانے سے اجر وثواب نہ ملے گا، ہرگز درست نہیں، ایسا سمجھنا سراسر نادانی اور جہالت ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے، آمین۔

ایک اور روایت کی وجہ سے بڑی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

اپنے مدعیٰ کو ثابت کرنے کے لئے حضرت مولانا سعد صاحب اسی سیاق میں یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں جیسا کہ اورنگ آباد کے اجتماع میں بھی بیان فرمایا کہ: ایک صحابی نے جہاد میں تیر ملنے کا ارادہ بھی کرلیا، اس کے متعلق رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص کو سوائے تیر کے دنیا وآخرت میں کچھ بھی نہ ملے گا، اس سلسلہ میں اصولی طور پر چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

(۱) سیرت نبویہ اور احادیث مبارکہ پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر نیت کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں، اصالۃً، اور ضمناً وتبعاً، اصالۃً کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصد اور اصل غرض ہی اس کام سے یہ ہے کہ اگر یہ مقصد حاصل نہ ہو تو یہ کام بھی نہ کیا جائے، مثلاً جہاد کا اصل مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے، جس میں فتح کی صورت میں مالِ غنیمت بھی حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ ضمنی اور ثانوی درجہ کی چیز ہے، اگر کوئی شخص مالِ غنیمت کے حصول ہی کی غرض سے جہاد کرے کہ اگر مال ملنے کی توقع ہو تو جہاد کرے ورنہ جہاد ہی نہ کرے تو یقیناً یہ خلوص کے منافی ہوگا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد وہ ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہو، اور جو جہاد حصولِ مال کی نیت سے ہو وہ جہاد فی سبیل نہیں ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

أن رجلاً أعرابياً أتى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله ﷺ الرجل يقاتل للمغنم والرجل يقاتل ليذكر والرجل يقاتل ليرىٰ مكانه فمن في سبيل الله؟ فقال رسول الله ﷺ من قاتل لتكون كلمة الله أعلىٰ فهو في سبيل الله.

(مسلم شریف، باب من قاتل لتكون كلمة الله العليا فهو في سبيل الله، کتاب الامارۃ، حدیث۴۸۹۶)

اور ضمناً وتبعاً کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود تو اگر چہ وہ چیز نہیں ہے لیکن ضمناً اور ثانوی درجہ میں یہ بھی مقصود بن جائے، اس طور پر کہ اصل

نیت کے ساتھ اس کو بھی کسی درجہ میں مقصود بنالے کہ اس کی وجہ سے مزید شوق اور سرگرمی پیدا ہو جائے یا مزید تحریک ہو جائے، اس درجہ میں اگر اصل مقصد یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ ثانوی درجہ میں دوسری چیزوں کی بھی نیت کر لی جائے مثلاً جہاد میں اصل مقصد تو اعلاء کلمۃ اللہ ہو، لیکن ثانوی درجہ میں مالِ غنیمت، تیر وکمان، سیف وسنان، غلام وباندیوں کو بھی مقصود بنالیا جائے، اور اعلاء کلمۃ اللہ کے ساتھ ان چیزوں کے حصول کی بھی نیت کر لی جائے تو یہ ہرگز اجر وثواب کے اور خلوص کے منافی نہیں، اور نہ ہی تقویٰ وتدیّن کے خلاف ہے، چنانچہ کتنے موقعوں میں خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ نے جہاد کے میدان میں عین قتال کے موقع پر یہ اعلان ہی اس عنوان سے کیا کہ:

من قتل قتيلاً فله سلبه (مسلم شریف) جو کسی کافر کو قتل کر دے گا (تو مالِ غنیمت میں جو حصہ ملتا ہے وہ تو اس کو ملے گا ہی اس کے علاوہ) اس مقتول کافر کا جو بھی ساز وسامان اور آلاتِ حرب ہتھیار وغیرہ ہوں گے خصوصیت کے ساتھ وہ اُسی مقاتل مجاہد کو ملیں گے۔

ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جہاد کے موقع پر اس اعلان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں میں حصولِ مال کی کثرت کے جذبہ سے مزید شوق وہمت پیدا ہو، ان کی حرکت وقوت میں جوش ہو اور ان کا حوصلہ بلند ہو، حالانکہ یہ حصولِ مال کے ذریعہ سے شوق دلانا اور کسی درجہ میں اس کو مقصود بنانا ہی ہے، ورنہ پھر اس اعلان کا مقصد ہی کیا، تو کیا رسول اللہ ﷺ کے اس اعلان کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ آپ نے حصولِ مال کی لالچ اور دنیا کے لئے جہاد کرنے کی ترغیب دی تھی، جو کہ خلوص کے منافی ہے؟ حاشا وکلا، صحابہ کرام بڑے فقیہ اور سمجھدار تھے، وہ اس فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اصالۃً نیت اور ضمناً وتبعاً نیت میں کیا فرق ہے، جہاد کا اصل مقصد بیشک اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہے، لیکن ثانوی درجہ میں یعنی ضمناً وتبعاً اگر حصولِ مال کو بھی مقصود بنالیا جائے تو یہ خلوص کے منافی نہیں، رسول اللہ ﷺ کا یہ اعلان بھی اسی نوعیت کا تھا، جس میں ثانوی درجہ میں حصولِ مال کے جذبہ سے شوق دلایا گیا۔

الغرض اصالۃً نیت اور ضمناً وتبعاً نیت کا فرق تو خود شریعت میں موجود ہے، دونوں کو ایک درجہ میں نہیں رکھا جاسکتا، اگر کوئی شخص جہاد میں اصالۃً مال ہی کی نیت کرے یا سیف وسنان اور تیر وکمان ہی کی نیت کرے کہ اصل مقصود ہی اس کا جہاد سے ان ہی چیزوں کا حصول ہو تو یہ بیشک خلوص کے منافی ہے، اور ایسا شخص مستحق نار ہوگا، اور وہ مال بھی اس کے لئے قطعۂ نار ہوگا، لیکن جس شخص نے اصل مقصد تو اعلاء کلمۃ اللہ کو بنایا اور ثانوی درجہ میں حصولِ مال کی بھی نیت کر لی تو یہ ہرگز خلوص اور اجر وثواب کے منافی نہیں، بلکہ خود رسول اللہ ﷺ سے ضرورۃً اس کی ترغیب وتخصیص ثابت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک غزوہ میں رسول اللہ ﷺ کے اسی نوع کے اعلان کے بعد حضرت قتادہؓ نے ایک تلوار کا مطالبہ کیا، ایک بار، دو بار، تین بار، قصہ طویل ہے، بالآخر ثبوت ہو جانے کے بعد آپ نے حضرت قتادہؓ کو تلوار دلائی، آپ نے ان سے یہ نہیں فرمایا کہ اتنے اصرار سے اس کا مطالبہ کیوں کر رہے ہو، کیا تم نے اسی لئے جہاد کیا تھا، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

جلس رسول الله ﷺ فقال: من قتل قتيلاً له عليه بينة فله سلبه قال: (أى قال قتادة) فقمت: فقلت: من يشهدلي؟ ثم جلست.....ثم قال ذلک الثالثة فقال رسول الله ﷺ مالک يا أبى قتادة الخ.

(مسلم شریف، کتاب الجہاد، حدیث ۴۵۶۳، باب استحقاق القاتل سلب القتیل)

غزوۂ طائف کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جب کفار کا محاصرہ کیا اور مالِ غنیمت حاصل نہیں ہوا، تو رسول اللہ ﷺ کی رائے واپسی کی ہوئی، اس پر بعض صحابہ نے کہا کہ ابھی تو ہم کو فتح حاصل نہیں ہوئی اور ہم ایسے ہی واپس ہو جائیں، آپ نے صحابہ کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے مزید قیام کیا، آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اچھا کیا فتح اور مالِ غنیمت ہی کے لئے جہاد کرتے ہو؟ رسول اللہ ﷺ نے بھی ان صحابہ کے متعلق یہی سمجھا تھا کہ جہاد سے ان کا اصل مقصد تو اعلاء کلمۃ اللہ ہی ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ ثانوی درجہ میں ہے، اس لئے آپ نے ان پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

حاصر رسول الله ﷺ أهل الطائف فلم ينل منه شيئاً فقال إنا قافلون إنشاء الله قال أصحابه نرجع ولم نفتتحه؟ الخ.

(مسلم شریف باب غزوۃ الطائف، حدیث ۴۵۹۶، کتاب الجہاد، فتح الملہم ص ۱۳۵، ج ۹)

اسی مذکورہ بالا تفصیل سے ان بعض صحابہ کرام کی طرف سے اس غلط فہمی کا ازالہ بھی ہوجاتا ہے جس میں بعض صحابہ نے جہاد وقتال سے پہلے دعوت دی، اور کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا، اس پر بعض صحابہ نے امیر لشکر سے کہا ارے ہمکولڑنے دیتے، ہم قتال کرتے، غلام باندیاں قبضے میں آتیں، مالِ غنیمت حاصل ہوتا، تم نے ان سب سے ہم کو محروم کردیا، اس سے شبہ ہوتا ہے کیا ان صحابہ کا مقصود محض حصولِ مال تھا، اور وہ جہاد میں مخلص نہ تھے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ ہرگز نہیں وہ سارے صحابہ مخلص تھے، ان سب کا جہاد سے اصل مقصد تو اعلاء کلمۃ اللہ ہی تھا اور حصولِ غلام اور باندی اور حصولِ غنیمت سب ثانوی درجہ میں تھا، اور یہ خلوص اور اجر وثواب کے منافی نہیں، ورنہ صحابہ کرام پر اعتراض لازم آئے گا، اسی وجہ سے اطلاع کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بھی ان صحابہ پر کوئی نکیر نہیں فرمائی، اور بعض موقعوں میں خود رسول اللہ ﷺ نے بھی جہاد کے موقع پر دعوت نہیں دی، بلکہ بغیر دعوت ہی کے قتال فرمایا، کیونکہ دعوت ان کو اس سے پہلے پہنچ چکی تھی، جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے:

عن ابن عون قال کتبت إلى نافع أسئله عن الدعاء قبل القتال؟ قال فکتب إلى إنما کان ذالک في أول الإسلام، قد أغار رسول الله ﷺ على بني المصطلق وهم غارّون، وأنعامهم تسقىٰ على الماء الخ.

(مسلم شریف، باب جواز الإغارة على الکفار الذين بلغتهم دعوة الإسلام من غير تقدم الإعلام، حدیث ۴۴۹۶، کتاب الجہاد، فتح الملہم ص ۱۶، ج ۹)

مذکورہ بالا تفصیل سے اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہے کہ جہاد وقتال ہو یا دین کی دوسری خدمات مثلاً تعلیم قرآن وتعلیم وحدیث وغیرہ، ثانوی درجہ میں اگر تنخواہ کو بھی اس میں مقصود بنالیا جائے اور ضمناً وتبعاً اس کی بھی نیت کرلی جائے تو یہ ہرگز خلوص اور اجر وثواب کے منافی نہیں، یہ تو ایسا ہی ہے جیسے حج میں جانے والا شخص پورے خلوص سے حج میں جاتا ہے اور ثانوی درجہ میں یہ بھی اس کی نیت ہوتی ہے کہ وہاں سے آبِ زمزم، کھجور اور جائے نماز بھی لاؤں گا، کچھ تجارت بھی کرلوں گا، تو یہ ہرگز اس کے خلوص اور اجر وثواب کے منافی نہیں، اور ایک وہ شخص ہے جو حج میں صرف اور صرف اسی غرض سے جارہا ہے کہ وہاں جاکر تجارت کروں گا، چندہ کروں گا، سامان خرید کر لاؤں گا وغیرہ وغیرہ، ایسا شخص ہرگز حج میں مخلص نہیں اور اس کو حج کا پورا اجر وثواب نہیں ملے گا، کیونکہ اس نے ان چیزوں ہی کو اصل مقصود بنالیا ہے، یہ فرق ہے اصالۃً نیت اور ضمناً وتبعاً نیت میں۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس کی بڑی اچھی وضاحت فرمائی ہے، جو درج ذیل ہے، ارشاد فرماتے ہیں:

''اگر اصل مقصود حج ہے اور تجارت تابع ہے جس کی علامت یہ ہے کہ اگر تجارت کا سامان نہ ہوتا تب بھی حج کو ضرور جاتا تو اس صورت میں خلوص باقی ہے اور حج کا ثواب بھی کم نہ ہوگا، اور اگر تجارت اصل مقصود ہے اور حج تابع ہے تو اس صورت میں گناہ ہوگا اور یہ شخص مخلص نہیں ریاکار ہوگا، کیونکہ مخلوق کو دھوکہ دے رہا ہے کہ جاتا ہے تجارت کے لئے اور ظاہر کرتا ہے کہ حج کو جارہا ہوں''

اگر اصل مقصود حج ہو اور تجارت تابع ہو تو اس صورت میں مالِ تجارت لے جانا افضل ہے یا نہ لے جانا؟ تو اگر زادِ راہ خرچ وغیرہ بقدر کفایت موجود ہو تو افضل یہ ہے کہ تجارت کا سامان نہ لے جائے کیونکہ اس میں خلوص زیادہ ہے، اگر زادِ راہ بقدر ضرورت ہے لیکن بقدر کفایت نہیں اور تجارت کی نیت تابع ہے تو اس نیت سے کہ سفر میں سہولت ہوگی اس نیت سے اس کے لئے مالِ تجارت لے جانا باعث ثواب ہے''

(تجدید معاشیات ص ۲۰۴، ملفوظات کمالاتِ اشرفیہ ص ۱۰۰)

''اگر حج اس لئے ہے کہ (حج میں) تجارت کریں گے تو مکروہ وناجائز ہے، اور اگر تجارت اس لئے ہے کہ حج اچھی طرح اطمینان سے کریں گے تو جائز ہے'' (وعظ روح الحج والثج ملحقہ سنت ابراہیم ص ۴۱۶)

اس کے بعد سمجھئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن صحابی کو جہاد میں تیر کا ارادہ کرنے پر یہ تنبیہ فرمائی تھی کہ اُس شخص کو دنیا وآخرت میں سوائے تیر کے کچھ اور نہ ملے گا، یہ تنبیہ آپ نے اس لئے بیان فرمائی کہ ان صاحب نے تیر ہی کو اصل مقصود بنالیا تھا، اور آپ سے سوال ہی ایسے شخص کے بارے میں کیا گیا تھا جس نے جہاد میں تیر حاصل ہونے کو بھی اصل مقصد بنالیا ہو، اس لئے آپ نے یہ بات فرمائی، لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا اور علی الاطلاق یہ بیان کرنا کہ ایک تیر کا ارادہ کرنے والے صحابی کو بھی آپ نے فرمادیا کہ اس شخص کو سوائے تیر کے کچھ نہ ملے گا، پھر اس کو مدارس کے علماء

واساتذہ پر منطبق کرنا، یہ بڑی علمی غلطی وہی شخص کرسکتا ہے جس کو مذکورہ بالا حقائق اور اصالۃً اور ضمناً نیت کے فرق سے بالکل واقفیت نہ ہو، اور ناواقفیت کے باوجود ایسے مضامین بیان کرنا جن سے علماء ودینی خدام سے دوری و بدگمانی پیدا ہو، بڑی خطرناک چیز ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبادہ ابن صامتؓ کی روایت سے ایک بڑی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

حضرت مولانا محمد سعد صاحب اور دوسرے تبلیغی حضرات فرماتے ہیں کہ علم کو بیچو نہیں، رسول اللہ ﷺ نے امت کا مزاج یہی بنایا ہے کہ علم کو بیچنا نہیں چاہئے، یعنی بغیر تنخواہ کے پڑھانا چاہئے اور اسی پر تفریع کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تعلیم دین کے ساتھ معاش کے لئے تجارت کرو، مکتب کو مکسب مت بناؤ، اور اس سلسلہ میں حضرت ابی ابن کعبؓ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک طالبعلم کو انہوں نے قرآن پاک پڑھایا تھا اس کے باپ نے خوش ہو کر بطور ہدیہ کے ان کو کمان دی تھی اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ تو دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہے، روایت درج ذیل ہے:

حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو ایک سورت قرآن کی سکھائی اس نے ان کے پاس کوئی کپڑا یا دھاری دار اونی چادر بطور ہدیہ بھیجی اس کا انہوں نے نبی ﷺ سے تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا اگر تو نے اس کو لے لیا تو تجھے آگ کا کپڑا پہنایا جائے گا، اور انہی سے ایک روایت میں ہے کہ میں نے ایک آدمی کو قرآن سکھلایا اس نے مجھے کمان ہدیہ کی، پس اسی پہلا جیسا قصہ بیان کیا۔

(کمافی الکنز ص ۲۴۰، ج ۱، حیاۃ الصحابہ ص ۲۵۴، ج ۳)

حضرت عبادہ بن صامتؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک شخص کو قرآن پڑھاتا تھا اس نے مجھے ایک کمان بطور ہدیہ دی، اس سے عمدہ کمان لکڑی کے اعتبار سے اور مڑنے میں مَیں نے نہیں دیکھی، میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آیا اور میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ کا کیا خیال ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ تیرے دونوں بازوؤں کے درمیان آگ کی چنگاری ہے اگر تو نے اس کمان کو لٹکایا، یا آپ نے فرمایا اگر تو نے اس کو گردن میں ڈالا۔ (کذافی الکنز ص ۲۳۱، ج ۱، حیاۃ الصحابہ ص ۲۵۴، ج ۳)

اسی طرح کی اور بھی بعض روایات ہیں جن کو حیاۃ الصحابہ میں نقل کیا گیا ہے جو سب سے بڑا ماخذ اور دلیل سمجھی جاتی ہیں اصحابِ تبلیغ کے اس دعوے کی کہ تعلیم وتدریس پر تنخواہ لینا اجر وثواب کے منافی اور عذاب کا ذریعہ ہے، اور جن کو بیان کر کے آج لوگوں کا یہ ذہن بنایا جاتا ہے کہ تعلیم دین بغیر تنخواہ ہی کے ہونا چاہئے، تنخواہ کے ساتھ تعلیمِ دین یا تعلیمِ قرآن نہ کوئی دین کی خدمت ہے اور نہ باعث اجر وثواب، اور تائید میں ان ہی روایات کو پیش کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں نہایت اختصار سے ہم چند اصولی باتیں پیش کرتے ہیں۔

﴿۱﴾ واقعہ یہ ہے کہ روایات سے استدلال واستنباط اور اجتہاد وقیاس یہ منصب ائمہ مجتہدین وعلماء مستنبطین کا ہے، نا اہلوں کے اجتہاد واستنباط کرنے کا نتیجہ وہی ہوگا جو آج نگاہوں کے سامنے ہے، ان روایات کا سب سے زیادہ صحیح مطلب سمجھنے والے صحابہ کرام اور خلفائے راشدین تھے، سب سے پہلے دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام نے ان روایات کا کیا مطلب سمجھا، اور اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ اور خلفائے راشدین کے تفقہ وتدیّن پر اعتماد کیا ہے، اور ان کی اتباع وپیروی کا امت کو حکم بھی دیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین الحدیث**، کیونکہ ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ حالات ومقالات سب تھے، کس پس منظر اور کس حال میں آپ نے کون سی بات فرمائی تھی، اور اس بات سے آپ کا مقصد کیا تھا، وہ اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے صحابہ کرام نے ان روایات سے جو مطلب سمجھا وہی قابل اعتماد اور قابل عمل وقابل بیان ہوگا، کیونکہ بسا اوقات ایک موضوع اور مسئلہ سے متعلق مختلف روایتیں ہوتی ہیں، صحابہ کرام کبھی کسی ایک روایت کو خاص حالت پر محمول کرتے ہیں اور دوسری روایت کا مصداق علٰحدہ متعین کرتے ہیں، اسی روش کو ہمارے ائمہ مجتہدین نے بھی اختیار کیا ہے، مثلاً اسی موضوع سے متعلق بعض روایتیں تو حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبادہ بن صامتؓ کی ہیں، جس میں

آپ نے تعلیم قرآن پر ملی ہوئی چیز کو قطعۂ نار فرمایا، لیکن دوسرے موقع پر آپ نے تعلیم قرآن کی اجرت کو نہ صرف جائز قرار دیا، بلکہ اس کا مشورہ دیا، چنانچہ مسلم شریف کی طویل روایت میں ہے کہ ایک صحابی نے ایک خاتون سے نکاح کا ارادہ ظاہر کیا، آپ نے فرمایا تمہارے پاس مہر میں دینے کو کچھ ہے؟ ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا، آپ نے فرمایا تم کو قرآن پاک آتا ہے، انہوں نے عرض کیا جی، آپ نے فرمایا اچھا اس خاتون کو جس سے تمہارا نکاح ہونے جا رہا ہے قرآن پاک کی تعلیم دے دینا، یہی تمہارا مہر ہے، آپ نے تعلیم قرآن کو اجرت اور عوض مقرر فرمایا، جیسا کہ دراہم ودنانیر سے مہر مقرر کیا جاتا ہے، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے بیس آیتوں کے سکھلانے کو مہر مقرر فرمایا روایت کے مختصر الفاظ یہ ہیں:

فلما جاء قال: ماذا معک من القرآن؟ قال: معي سورة كذا وسورة كذا عددفقال: تقروهن عن ظهر قلبک؟ الخ.

(مسلم شریف، حدیث ۳۴۷۲، باب الصداق وجواز كونه تعليم قرآن)

وفي حديث أبى هريرة فعلمها عشرين آية وهى إمرأتک. (فتح الملہم)

قال الشيخ العثماني في فتح الملهم: قال ابن عابدين: .....إن الفتوىٰ على جواز الإستئجار لتعليم القرآن والفقه فينبغي أن يصح تسميته مهراً لأن ما جاز أخذ الأجرة في مقابلته من المنافع جاز تسميته صداقاً كما قدمنا نقله عن البدائع ولهٰذا ذكر في فتح القدير هنا: أنه لما جوز الشافعي أخذ الأجرة على تعليم القرآن صحح تسميته مهراً فكذا نقول يلزم على المفتي به صحة تسميته صداقاً. (فتح الملہم شرح مسلم ص ۴۸۳، ج ۳ قدیم مکتبہ مدنیہ لاہور)

نیز ایک روایت میں آپ نے کتاب اللہ پر اجرت لینے کو احق وافضل قرار دیا ہے، چنانچہ ان ہی روایات کی بنا پر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ نے تعلیم قرآن پر بغیر کسی کراہت کے اجرت کو جائز قرار دیا ہے، اور احناف کے تمام فقہائے متأخرین نے ضرورۃً اس کے جواز بلا کراہت کا فتویٰ دیا ہے۔

وقال الإمامان مالک والشافعي تجوز الإجارة على تعليم القرآن لأنه استئجار لعمل معلوم ببدل معلوم، ولأن رسول الله ﷺ زوّج رجلاً بما معه من القرآن، فجاز جعل القرآن عوضاً وقد قال رسول الله ﷺ إنّ أحق ما أخذتم عليه أجراً كتاب الله. (الفقہ الاسلامی وادلتہ ص ۳۸۱۹ ج ۵، شرح مہذب للنووی ص ۱۹۴، ج ۱۵)

قال صاحب الكنز الحنفي: والفتوىٰ اليوم على جواز الاستئجاز لتعليم القرآن وهو مذهب المتأخرين من مشائخ بلخ. (تبیین الحقائق ص ۱۲۴، ج ۵)

ويجوز بالاتفاق الاستئجار على تعليم اللغة والأدب والحساب والخط والفقه والحديث ونحوها.

(الفقہ الاسلامی وادلتہ ص ۳۸۲۰، ج ۵)

﴿۲﴾ اس مسئلہ سے متعلق تمام روایات کو سامنے رکھتے ہوئے خلفائے راشدین اور صحابہ کرام نے یہی مطلب سمجھا ہے کہ تعلیم دین اور تعلیم قرآن پر وظیفہ اور تنخواہ لینا بغیر کسی کراہت وقباحت کے جائز ہے، نہ یہ اجر وثواب کے منافی ہے اور نہ ہی توکل وتقویٰ کے خلاف ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ نے خود معلّمین قرآن اور معلمین فقہ نیز ائمہ ومؤذنین کی تنخواہیں مقرر کی ہوئی تھیں، جس کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی۔ (ملاحظہ ہو ص ۱۷ و ۱۸)

قابل غور بات یہ ہے کہ یہی ابی ابن کعبؓ اور عبادہ بن صامتؓ ہیں جن کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا تھا کہ تعلیم قرآن پر رسول اللہ ﷺ نے کمان یا کپڑا لینے کو قطعۂ نار لینے کے ساتھ تنبیہ فرمائی، اور حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں تعلیم قرآن وتعلیم فقہ کے لئے جن صحابہ کا انتخاب کیا تھا ان میں خاص طور پر یہی صحابہ قابل ذکر ہیں، یعنی حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبادہ بن صامتؓ، جو رسول اللہ ﷺ سے تعلیم قرآن اور تعلیم دین پر کچھ لینے کی وعیدیں اور آپ کی تنبیہ بھی سن چکے تھے، اور حضرت عمر فاروقؓ کو بھی اس بات کا خوب علم تھا، لیکن ان سب کے باوجود تعلیم قرآن وتعلیم فقہ پر حضرت عمر فاروقؓ نے جن قراءِ صحابہ وفقہاءِ صحابہ کا نام تجویز کیا ان میں عبادہ ابن صامتؓ اور ابی ابن کعبؓ سرفہرست تھے، اور انہی

معلمین وقرّاءِ صحابہ کی حضرت عمر فاروقؓ نے تنخواہیں مقرر کی تھیں، لیکن کسی نے اس پر نکیر یا اعتراض نہ کیا، بلکہ تنخواہ لینے کو منظور فرمایا، حضرت ابی ابن کعبؓ نے بھی اس پر انکار نہ فرمایا، اگرچہ عذر اور بیماری کی وجہ سے اس وقت تعلیم قرآن کی خدمت نہ کر سکے تھے چنانچہ علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی کتاب ''الفاروق'' میں ''تذکرۃ الحفاظ'' اور ''اسد الغابۃ'' کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے پانچ بزرگ تھے جنہوں نے قرآن مجید کو آنحضرتؐ ہی کے زمانہ میں پورا حفظ کر لیا تھا، معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن الصامتؓ، ابی بن کعبؓ، ابوایوبؓ، ابودرداءؓ، ان میں خاص کر ابی بن کعبؓ سید القراء تھے، حضرت عمرؓ نے ان سب کو بلا کر کہا کہ شام کے مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ آپ لوگ جا کر قرآن کریم کی تعلیم دیجئے، ابوایوبؓ ضعیف اور ابی بن کعبؓ بیمار تھے، اس لئے نہ جا سکے، باقی تین صاحبوں نے خوشی سے منظور کیا۔

عبدالرحمٰن بن غنم کے حال میں طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو تعلیم فقہ کے لئے شام بھیجا تھا، عبادہ بن صامتؓ کے حال میں لکھا ہے کہ جب شام فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے ان کو اور معاذ بن جبلؓ اور ابو درداءؓ کو شام میں بھیجا، تا کہ لوگوں کو قرآن کریم پڑھائیں اور فقہ سکھلائیں۔

ابن جوزیؒ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان فقہاء کی تنخواہیں بھی مقرر کی تھیں، اور درحقیقت تعلیم کا مرتب و منتظم سلیقہ بغیر اس کے قائم نہیں ہوسکتا تھا'' (الفارق بحوالۂ اسد الغابۃ وتذکرۃ الحفاظ، مطبوعہ پاکستان، ص ۲۴۸ و ۲۵۴)

حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کا یہ طرزِ عمل بتلا رہا ہے کہ وہ حضرات تعلیم قرآن پر تنخواہ لینے دینے کو خلافِ شرع یا خلافِ تقویٰ وتوکل اور اجر وثواب کے منافی نہ سمجھتے تھے، اور نہ ہی تیر کمان والی روایات سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا، اور نہ اس حدیث کا یہ مطلب سمجھا کہ تعلیم قرآن پر اجرت یا ہدیہ کا لین دین علی الاطلاق غلط ہے، اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمر فاروقؓ ہرگز ایسا اقدام نہ کرتے اور دیگر صحابہ جن کے ساتھ خود یہ قصہ پیش آیا، ہرگز حضرت عمرؓ کے اس اقدام پر صبر نہ کرتے، بلکہ صاف انکار کر دیتے، جیسا کہ دوسرے موقعوں میں صحابہ کرام نے صاف حق گوئی کا اظہار فرمایا ہے۔

﴿۳﴾ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر ان روایات کا اور ان جملوں کا کیا مطلب جن میں رسول اللہ ﷺ نے تعلیم قرآن پر کچھ لینے دینے اور قبول کرنے پر تنبیہ فرمائی، اور لی ہوئی چیز کو آگ کا ٹکڑا قرار دیا، ان روایات کا کیا مطلب اور کیا ان کا مصداق ہوگا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، ہمارے ائمہ مجتہدین اور ہمارے اکابر علماء وفقہاء کو کہ انہوں نے ایسی توجیہات اور ایسی تصریحات فرما دی ہیں جس سے ہر حدیث کا مصداق علٰحدہ علٰحدہ متعین ہو جاتا ہے، اور کسی قسم کا کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

ہمارے اکابر فقہاء وعلماء نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ مفتیٰ بہ قول کے مطابق تعلیم دین، تعلیم قرآن، مؤذنی، امامت وخطابت کی ملازمت اور اس پر تنخواہ کا لین دین بغیر کسی کراہت وقباحت کے اس وقت جائز ہے جبکہ باقاعدہ عقد اجارہ اور شرعی معاملہ کے تحت ہو کہ کام کی مقدار اور اجرت دونوں متعین ہوں، یعنی باقاعدہ معاملہ اجرت وملازمت کے طور پر ہو، مثلاً کسی معلم کو مقرر کیا گیا کہ تم کو روزانہ اتنے گھنٹے تعلیم قرآن کرنا ہے اور تمہاری اتنی تنخواہ متعین ہے، خطیب کو مقرر کیا گیا کہ تم کو روز آنہ یا فلاں فلاں دن اتنے وقت تک تقریر کرنا ہے اور یہ تمہاری تنخواہ ہوگی، اسی طرح امامت ومؤذنی ہے جس کو مستقلاً اس کام کے لئے مقرر کیا گیا ہو اور اس کی تنخواہ مقرر کی گئی ہو، حضرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور تمام فقہائے متأخرین احناف کے نزدیک یہ سب بلا کراہت اور بلاشبہ جائز ہے۔ (درمختار شامی وغیرہ)

اور ایک صورت یہ ہے کہ نہ کوئی عقد اجارہ ہو نہ ملازمت اور کام کا تعیّن، مثلاً کوئی اچھا قاری بروقت چند اوقات کی نماز پڑھا دے یا کوئی واعظ اور خطیب وعظ کہہ دے، یا کوئی قاری کسی کو قرآن پاک پڑھا دے، چونکہ یہ خدمت کسی معاملہ اور عقد کے تحت نہیں ہے، اس لئے اس پر اجرت کا لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں، ہمارے اکابر فقہاء نے واضح طور پر اس کی صراحت فرمائی ہے، چنانچہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے فتاویٰ میں ہے:

سوال: امامت اور وعظ پر تنخواہ لینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب: استیجار علی الطاعات (یعنی عبادات پر اجرت لینا) جو ناجائز ہے اس میں سے امامت مستثنیٰ ہے، اور بعض لوگوں نے وعظ کو مستثنیٰ کہا ہے اور بعض نے عدم جواز میں داخل رکھا ہے، تطبیق کی صورت یہ ہے کہ اگر وعظ کی نوکری کر لی مثل امامت کے تو اجرت لینا جائز ہے اور اگر نوکری نہیں ہے عین وقت پر اجرت کی شرط کرے تو جائز نہیں، جیسے عین وقت پر (چند وقت کی) امامت پر اجرت مانگنے لگے (تو یہ نہ جائز ہے)

(امداد الفتاویٰ ص ۳۹۰، ج ۳، کتاب الاجارہ، سوال ۳۶۸)

حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہیؒ اپنے فتاویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

''کسی غیر مجتہد کا قیاس شرعاً معتبر نہیں، وعظ پر بھی اگر اجارہ کیا جائے تو شرطِ اجارہ وقت و اجرت وغیرہ کی تعیین کر کے کیا جائے، مثلاً یہ کہ ہر روز ایک گھنٹہ وعظ کہنا ہوگا، اور اس قدر تنخواہ ماہانہ ملے گی''

جس طرح تعلیم وتدریس کی ملازمت درست ہے اسی تذکیر وتقریر کی ملازمت بھی درست ہے، کام متعین کر لیا جائے، مثلاً ہر روز ایک گھنٹہ یا ہر جمعہ کو دو گھنٹے تقریر لازم ہوگی اور اتنا معاوضہ دیا جائے گا، یا مقرر کو مستقل ملازم تقریر کے لئے رکھ لیا جائے کہ جلسوں میں بلانے پر یا بغیر بلائے دیگر مقامات پر جا جا کر تقریر کرے۔ (فتاویٰ محمودیہ ص ۲۲۳ و ۲۲۶، ج ۲۵، سوال ۹۲۱۷ و ۹۲۲۰، مطبوعہ زکریا بکڈپو، دیوبند)

اکابر علماء وفقہاء کی مذکورہ بالا تفصیلات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھنا چاہئے کہ حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبادہ بن صامتؓ جن کو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم قرآن پر کمان یا کپڑا قبول کرنے کی وجہ سے تنبیہ فرمائی نیز قطع نار کی خبر دی تھی، وہ دوسری صورت سے تھا یعنی اس میں نہ عقد اجارہ تھا نہ ملازمت تھی اور نہ ہی وقت کی پابندی لازم تھی، محض حسبۃً للہ اختیاری طور پر تعلیم قرآن کیا کرتے تھے کہ جس وقت جو آ گیا پڑھا دیا، نہ معلّم وقت کا پابند تھا نہ کوئی اجرت متعین تھی، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی کہ جو کچھ دیا گیا ہے کمان یا کپڑے کی شکل میں اگرچہ ہدیہ کے عنوان سے دیا گیا ہے لیکن کہیں یہ اجرت نہ ہو جائے حالانکہ ایسے موقع پر اجرت جائز نہ تھی۔

اور حضرت عمر فاروقؓ نے معلّمین قرآن و معلّمین فقہ کے لئے جو تنخواہیں مقرر کی تھیں اس کی نوعیت دوسری تھی، یعنی باقاعدہ معلم کا تقرر تھا، عمل اور اجرت دونوں کی تعیین تھی، اسی لئے حضرت فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرام نے اس کو جائز قرار دیا، آج کل ائمہ و مؤذنین اور معلمین مدرسہ جو تعلیم قرآن وتدریس کرتے ہیں خود فیصلہ کیجئے کہ آیا ان میں اوقات کی پابندی اور کام کی تعیین ہوتی ہے یا نہیں اور شرعی عقد اجارہ ہوتا ہے یا نہیں جس میں کام کے ساتھ تنخواہ بھی متعین ہوتی ہے؟ یقیناً ہوتی ہے اس لئے یہ بلاشبہ جائز ہے، البتہ بروقت یعنی وقتی طور پر تھوڑی دیر کے لئے بغیر عقد اور بغیر تعیین وقت کے اگر کوئی کسی کو کچھ سکھا پڑھا دے، اس پر اجرت لینا دینا جائز نہیں ہوگا، یہ فرق ہے جس کو ہمارے فقہاء اور اکابر علماء نے واضح طور پر بیان کیا ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ نے ابی ابن کعبؓ اور عبادہ بن صامتؓ کے جس واقعہ میں ان کو تنبیہ فرمائی تھی وہ اس واسطہ کہ وہاں پر اجرت وعمل کا کوئی تعیّن نہ تھا، اور حضرت عمر فاروقؓ کے معاملہ کی حیثیت وہ ہے جس میں اجرت وعمل کا تعیّن تھا، اس لئے دونوں کا مصداق الگ الگ ہیں۔

یہ ہے اصل مسئلہ کی حقیقت، اس پوری تفصیل سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت ابی ابن کعبؓ اور عبادہ بن صامتؓ کے قصہ سے یہ استدلال کرنا کہ تعلیم قرآن بغیر اجرت کے ہونا چاہئے علم کو بیچو نہیں، اجر و اجرت دونوں جمع نہیں ہو سکتے، اور اجرت لینے کو رسول اللہ ﷺ نے قطعۃً نار فرمایا ہے، یہ استدلال کس حد تک درست ہو سکتا ہے، ہر ادنیٰ عقل وفہم رکھنے والا مذکورہ بالا تفصیل کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود ہی آسانی سے فیصلہ کر سکتا ہے۔

کیا زناکار لوگ تعلیم قرآن پر اجرت لینے والوں سے پہلے جنت میں جائیں گے؟

''حیاۃ الصحابہ'' کے اثر کی تحقیق

حضرت مولانا محمد سعد صاحب اور دوسرے اصحاب تبلیغ جو معلّمین و مدرسین کو بغیر تنخواہ کے پڑھانے کی ترغیب اور معاش کے لئے تجارت کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں، وہ حضرات خلفائے راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ کے معمول نیز فقہاء کرام کی تصریحات اور اکابر علماء دیوبند

وسہارنپور کے تعامل پر اچھی طرح غور کریں اور خود ہی فیصلہ کریں کہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف منسوب وہ اثر جو حیاۃ الصحابہ میں نقل کیا گیا ہے، جس کو یہ حضرات بطور دلیل کے پیش کرتے ہیں، کتنا وزن رکھتا ہے؟

کتنی واضح اور بدیہی بات ہے کہ تعلیم قرآن پر معلّمین ومدرّسین کو اصرار کے ساتھ تنخواہ دینے کا حضرت عمرؓ کا وہ معمول جس کی تفصیل ماقبل میں گزری، اور اس کے ساتھ حضرت عمرؓ یہ بھی فرمائیں کہ:

"یا أهل العلم والقرآن لا تأخذوا للعلم والقرآن ثمناً فتسبقكم الزناة إلى الجنة" (حیاۃ الصحابہ ص ۳۳۴، ج ۳)

کہ اے علم وقرآن والو! علمِ قرآن کی قیمت نہ لو کہ تم سے پہلے تو زناکار لوگ جنت میں چلے جائیں گے؟

مجاہد سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا کہ اے اہل علم اور اے اہل قرآن! تم علم اور قرآن کے لئے کوئی قیمت نہ لو اگر ایسا کروگے تو زناکار جنت کی طرف تم پر سبقت لے جائیں گے۔ (اخرج الحاکم ص ۵۴۰، ج ۳، حیاۃ الصحابہ ص ۲۵۵، ج ۳، حصہ ہشتم)

حضرت عمرؓ کی طرف منسوب اس اثر کے متعلق چند باتیں پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) عقلِ سلیم ہرگز اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ ایک طرف تو حضرت عمرؓ اتنے اہتمام سے فقہائے صحابہ اور معلمین صحابہ نیز ائمہ ومؤذّنین کی تنخواہیں مقرر کریں، اور اس کے لینے پر اصرار کریں اور دوسری طرف مذکورہ اثر کے ذریعہ ان کی اس طرح تذلیل وتحقیر کریں کہ زناکاروں کو اہل علم واہل قرآن (جن کو حدیث پاک میں نبی کا جانشین کہا گیا ہے) " انّ العلماء ورثة الانبیاء" ان کے مقابلہ میں زناکاروں کو اتنی فوقیت وترجیح دیں کہ علماء سے پہلے ان کے جنّت میں جانے کا اظہار فرمائیں، حضرت عمرؓ کی شان سے یہ بات بہت مستبعد بلکہ خلافِ عقل ہے۔

(۲) زناکاروں کے اہل علم سے پہلے جنت میں جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، زناکار جب تک اس دنیا ہی میں اپنے گناہ سے توبہ نہ کرلیں یا حق تعالیٰ ان کو معاف نہ کردے یا پھر دوزخ میں جاکر اپنے جرم کی سزا نہ بھگت لیں، اس وقت تک وہ جنت میں داخل ہی نہیں ہوسکتے، کیونکہ خود قرآنِ پاک سے واضح طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جنت میں وہی لوگ داخل ہوں گے جو زنا نہیں کرتے، اور جو زناکار ہوں وہ تو دوزخ میں جائیں گے کیونکہ اہل جنت کے اوصاف میں فرمایا گیا ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے، چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً. (سورہ الشعراء پ ۱۹)

ترجمہ ومطلب: اور وہ (یعنی جنت میں جانے کے مستحق) وہ لوگ ہوں گے جو اس نفس کو قتل نہیں کرتے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا ہے مگر حق کے ساتھ اور وہ زنا نہیں کرتے، اور جو شخص ایسے کام کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔

تو حیاۃ الصحابہ کا یہ اثر تو اس نص قطعی کے خلاف ہوا، جس کو مولانا سعد صاحب اور دوسرے حضرات نے بیان کیا۔

زنا کی حدیث پاک میں کتنی سخت وعید بیان کی گئی ہے، نبی کریم ﷺ نے یہاں تک بیان فرمایا کہ:

زناکار جب زنا کرتا ہے اس حال میں اس کا ایمان ہی نہیں باقی رہتا۔

لا يزني الزاني حين يزني وهو مؤمن. (رواہ البخاری ومسلم، حدیث ابی ہریرۃ، کتاب الکبائر للذہبی ص ۵۰)

اور ایک حدیثِ پاک میں آیا ہے کہ ایک موقع پر آپ کو تنّور کی دہکتی ہوئی آگ میں کچھ لوگوں کو جلتا ہوا دکھلایا گیا، آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا یہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ آپ کی امت کے زناکار لوگ ہیں۔

فقلت من هؤلاء یا جبرئیل: قال هؤلاء الزناة والزواني. (رواہ البخاری، کتاب الکبائر للذہبی ص ۵۱)

اس لئے یہ کہنا ہی غلط ہے کہ زناکاران علماء وقراء سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے جو عوض لے کر تعلیم دیتے ہوں، علماء سے پہلے تو کیا داخل ہوتے دوزخ میں جاکر زنا کی سزا بھگتنے سے پہلے جنت میں داخل ہی نہیں ہوسکتے، یا پھر اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے معاف کردے، یا کسی حافظ وعالم کی سفارش سے ان کو جنت میں داخلہ نصیب ہوجائے جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ ایک حافظ کی سفارش سے اللہ تعالیٰ ایسے دس

گنہگاروں کو جنت میں داخل کرے گا جن کے لئے دوزخ واجب ہو چکی تھی، اسی طرح اہلِ علم کی سفارش سے بے شمار لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا، جو مستحقّ نار ہو چکے تھے۔

(تفسیر مظہری، سورۂ بنی اسرائیل، تحت قولہ تعالیٰ عسیٰ أن یبعثک پ۱۵، ابن ماجہ، بیہقی، دیلمی عن ابن عمر، معارف القرآن پ۱۵، ص۵۰۷، ج۵)

زنا کاروں کو اگر کسی حافظ یا عالم یا شہید کی سفارش یا اللہ کا فضل نصیب ہو جائے تو ان کو بھی جنت میں داخلہ نصیب ہو جائے گا، ورنہ قرآن کے فیصلہ کے مطابق تو زنا کاروں کا دوزخ میں جانا طے ہے۔

(۳) سند اور روایات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ اثر بالکل مردود اور نا قابلِ اعتبار ہے، اس سلسلہ میں ہم مزید کسی تحقیق اور تفصیل میں جائے بغیر صرف مفتی شعیب اللہ صاحب بستوی (مفتی مظاہر علوم سہارنپور) کا وہ مضمون نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، جو انہوں نے اُس وقت تحریر فرمایا تھا جب کہ مولانا سعد صاحب نے مظاہر علوم کے احاطہ میں اپنی خاص مجلسِ وعظ میں اسی انداز کی بات فرمائی تھی، اور بطور دلیل کے یہ اثر پیش کیا تھا، جس پر مفتی شعیب اللہ صاحب اور دوسرے اساتذۂ کرام دامت برکاتہم نے حضرت اقدس مولانا محمد سلمان صاحب دامت برکاتہم (ناظم اعلیٰ مظاہر علوم سہارنپور) سے شکوہ کیا، اور ان کی بات پر سخت تنقید کی اور اس کی تردید کے لئے مفتی صاحب موصوف نے یہ مضمون لکھا جو مظاہر علوم سہارنپور سے ماہانہ نکلنے والے رسالہ میں شائع ہوا جو حضرت مولانا سلمان صاحب دامت برکاتہم ہی کی زیرِ نگرانی نکلتا ہے، اس کے مدیرِ مسئول بھی حضرت والا ہی ہیں، اُسی رسالہ سے اس اثر کے متعلق اس مضمون کا اہم حصہ ہم یہاں پر نقل کرتے ہیں جس کو حضرت ناظم صاحب کی تصویب وتائید کے بعد شائع کیا گیا، اس مضمون سے واضح ہو جائے گا کہ اس اثر کی کیا حقیقت ہے اور سند کے لحاظ سے یہ کیوں مردود اور نا قابلِ اعتبار ہے، لیکن عجیب بات ہے کہ اب پیشِ نظر جوابات میں اس شائع شدہ مضمون کے خلاف اسی اثر کو نقل کیا گیا ہے، ایسا کیوں؟

اب جناب مفتی شعیب اللہ صاحب کا مضمون ملاحظہ فرمائیے:

مولانا مفتی شعیب احمد صاحب بستوی (مفتی مظاہر علوم سہارنپور) کا مضمون

مولانا مفتی شعیب احمد صاحب بستوی (استاذ ومفتی مظاہر علوم سہارنپور) اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

”موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ: ہر چیز میں افراط وتفریط ہے، چنانچہ مسئلہ مذکورہ میں بھی یہی حال ہے، ایک دفعہ ایک صاحب (مراد مولانا سعد صاحب کاندھلوی ہیں) نے خصوصی مجلس وعظ میں یہ فرمایا کہ:

”تعلیم دین، فی سبیل اللہ یعنی بغیر اجرت کے ہونی چاہئے اگر تعلیمِ دین پر اجرت لی گئی تو اس کے بارے میں حضرت عمرؓ نے یوں فرمایا ہے کہ: ”جو شخص تعلیمِ قرآن پر اجرت لے اس سے قبل ایک زانی جنت میں جائے گا“

تعلیمِ دین کا فی سبیل اللہ ہونا نہایت ہی محبوب اور قابل رشک عمل ہے، اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن جس چیز کو فقہاء اور جمہور نے جائز قرار دیا ہو، اس اجرت کو اتنا گندا قرار دینا کہ یہ عمل زنا سے بھی بدتر ہو، ہمارے نزدیک یہ افراط وغلو والا طریقہ ہے، اسی لئے اس اثرِ عمر کی تحقیق شروع کی کہ آیا یہ اثر حضرت عمرؓ سے ثابت بھی ہے یا نہیں؟ اگر کہیں منقول ہے تو کہاں؟ ہماری دسترس میں جو کتابیں تھیں ان کو دیکھا مثلاً مسندِ عمر بن الخطابؓ، موسوعۃ آثار الصحابۃ وغیرہ، اس میں یہ اثر ہم کو نہیں مل سکا، پھر حیاۃ الصحابۃ دیکھی تو اردو حیاۃ الصحابۃ کی تیسری جلد میں یہ اثر اس طرح ہے:

”حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا: اے علم والو! علم اور قرآن پر قیمت نہ لو، ورنہ زنا کار لوگ تم سے پہلے جنت میں چلے جائیں گے“ (حیاۃ الصحابہ ص۲۶۵، ج۳)

اس پر محشی نے حوالہ ذکر کیا ہے: ”ذکر الخطیب فی الجامع کذا فی کنز العمال ص۲۲۹ ج۱“ چنانچہ کنز العمال دیکھی تو اس میں یہ اثر اس طرح مروی ہے:

عن لیث عن مجاهد قال قال عمر بن الخطابؓ یا اهل العلم و القرآن! لا تاخذوا للعلم ثمناً فتسبقکم الدناةإلی الجنة .

(الجامع ص ۵۱۶، ج ۱، حدیث ۸۸۷)

اس اثر میں اور کنز العمال والے اثر میں فرق یہ ہے کہ اس میں لفظ ''الدناۃ'' ہے جو ''دنی'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنیٰ ہیں خسیس اور کم درجہ کے لوگ، اور کنز میں لفظ ہے ''الزناۃ'' جو جمع ہے زانی کی، اور معنیٰ ہیں زنا کار لوگ، دونوں معنیٰ میں کتنا فرق ہے، وہ بالکل ظاہر اور واضح ہے۔

معلوم ہو چکا کہ خطیب کی الجامع میں لفظ ''الزناۃ'' کے بجائے ''الدناۃ'' ہے، جس کے معنیٰ خسیس اور کم تر درجہ کے لوگ ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ''الدناۃ'' والی روایت بھی ثابت نہیں، چہ جائیکہ ''الزناۃ'' کے لفظ کے ساتھ، اور اس کی چار وجوہ ہیں:

(۱) خطیب کی الجامع میں جو روایت ہے اس کی سند میں ایک راوی ہے معلّی بن ہلال، ان کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی کتاب ''تقریب التہذیب'' میں لکھا ہے ''**معلیٰؒ بن هلال بن سوید ابو عبدالله الطحان الکوفی اتفق النقاد علی تکذیبه**'' یعنی تمام اہل جرح ونقد کا ان کے جھوٹا ہونے پر اتفاق ہے۔ (تقریب التہذیب ص ۵۴۱)

(۲) اسی طرح اس میں ایک راوی ہیں جبارہ بن المغلّس، ان کے بارے میں تقریب میں لکھا ہے: ''**وهو ضعیف**'' یہ ضعیف ہیں۔

(تقریب التہذیب ص ۱۳۷)

(۳) مجاہد نقل کرتے ہیں کہ یہ مجہول ہیں، یہ کون سے لیث ہیں اس کی کوئی صراحت نہیں، عموماً مجاہد سے نقل کرنے والے لیث بن ابی سُلیم بن زُنیم ہوتے ہیں، جن کو امام مسلمؒ نے صحیح مسلم کے مقدمہ میں دوسرے درجہ کا راوی قرار دیا ہے، اور حافظ ابن حجرؒ نے تقریب میں یہ لکھا ہے کہ صدوق ہیں، لیکن ان کی روایتیں اس لئے ترک کردی گئیں کہ آخر عمر میں ان کو سخت اختلاط لاحق ہو گیا تھا، اور اختلاط کے قبل والی حدیثیں اختلاط کے بعد والی حدیثوں سے ممتاز نہ ہو سکیں۔

(۴) حضرت مجاہد براہ راست حضرت عمرؓ سے نقل کر رہے ہیں جب کہ مجاہد کی پیدائش سنہ ۲۱ ہجری میں ہے، اور حضرت عمرؓ کی وفات سنہ ۲۳ ہجری میں ہے، یعنی حضرت عمرؓ کے وصال کے وقت مجاہد صرف دو سال کے تھے اور ظاہر ہے کہ دو سال کا بچہ روایتِ حدیث نہیں کرسکتا، یقیناً ان دونوں کے درمیان کوئی واسطہ ہے، جو مذکور نہیں، لہٰذا یہ اثر منقطع بھی ہوا۔

(ماخوذ از: ماہنامہ مظاہر علوم ستمبر ۲۰۰۸ء ص ۳۱ مضمون مفتی شعیب احمد صاحب بستوی)

(۵) درایت کے لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو حضرت عمرؓ کا یہ اثر چونکہ خود ان کے معمول کے خلاف ہے، اس لئے نا قابل قبول ہوگا، بالفرض اگر اس کو تھوڑی دیر کے لئے صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کا وہی مطلب سمجھنا اور تاویل کرنا مناسب ہوگا جو قواعد شرعیہ کے مطابق ہو، بشرطیکہ اس کی عبارت میں اس کے منطبق کرنے کی گنجائش بھی ہو، وہ یہ کہ تعلیم قرآن اور تدریس قرآن پر اجرت لینا تو بغیر کسی کراہت کے بالکل جائز ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ کے دینے کا معمول رہا ہے، البتہ قرأتِ قرآن پر اجرت لینا ناجائز ہے، مثلاً کوئی شخص کسی سے کہے کہ مجھے قرآن پاک سُناؤ، اور وہ یوں کہے میں اتنے پیسے لوں گا تو سناؤں گا، اس قرأتِ قرآن پر اجرت لینا اور دینا دونوں ناجائز ہیں۔

حضرت عمرؓ کا مذکورہ اثر اولاً تو مذکورہ بالا مضمون میں ذکر کردہ تحقیق کے مطابق صحت اور پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا، اس لئے مردود اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

بالفرض اگر صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کا وہ مطلب مراد لینا ضروری ہوگا جو اوپر مذکور ہوا کیونکہ وہی قواعد شرعیہ کے مطابق ہے، اس کے خلاف دوسرا مطلب لینا درست نہ ہوگا، جس سے حضرت عمرؓ ہی کے قول وعمل میں تضاد سمجھا جائے۔

(۵) پانچویں بالفرض کسی درجہ میں اگر یہ اثر صحیح بھی ہوتا تو بھی اس نوعیت سے اس کو بیان کرنا جس سے علماء وقرّاء کی طرف سے عوام الناس کو بدگمانی وبدزبانی کا موقع ملے، سخت خطرناک بات ہے، اور یہ علماء کی شان میں بڑی بے ادبی وگستاخی اور ان سے بدگمانی وبدزبانی کا دروازہ

کھولنا ہے، اس لئے اس اثر کو بیان کرنا اور اس سے غلط نتائج نکالنا کسی طرح صحیح نہیں۔

ہم بہت بہت شکر گزار ہیں مظاہر علوم سہارنپور کے اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا سید محمد سلمان صاحب (ناظم مظاہر علوم سہارنپور) کے انہوں نے اُس موقع پر مداہنت سے بچتے ہوئے کس طرح حق پرستی وحق گوئی کا ثبوت دیا کہ اپنوں اور غیروں کی بلا خوف لومۃ لائم اپنے موقر رسالہ ''ماہنامہ مظاہر علوم سہارنپور ستمبر ۲۰۰۴ء'' میں مفتی شعیب احمد صاحب بستوی کے اس مضمون کو شائع فرمایا، جو اس کی تردید میں لکھا گیا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے اساتذہ اور ناظم صاحب نے جس حق پسندی اور اظہار حق کا ثبوت دیا ہے، ضرورت پڑنے پر تمام اہل حق علماء اور تمام اہل مدارس کو اسی حق پرستی وحق گوئی اور اظہار حق کا ثبوت پیش کرنا چاہئے، کیونکہ مولانا محمد سعد صاحب اور دوسرے اصحاب تبلیغ جو غلط باتیں بیان کرتے ہیں وہ صرف دو چار اور دس بیس نہیں بلکہ پچاسوں ایسی باتیں وہ اپنے اجتہاد سے بیان فرماتے ہیں جو حضرات اہل علم وارباب افتاء کے لئے سخت قابل اشکال ہیں، اور جن سے امت کو غلط پیغام پہنچ رہا ہے، مثلاً یہ کہ جہاد کے سارے فضائل دعوت الی اللہ اور خروج فی سبیل اللہ ہی کے لئے ہیں، قتال تو محض ایک عارض تھا، عارض پر اس کو محمول کرنا اور اصل پر محمول نہ کرنا یہ بڑی غلطی ہے، اور مثلاً یہ کہ اللہ کی نصرت عبادت میں نہیں بلکہ دعوت میں ہے اور مثلاً یہ کہ دین کی نصرت تعمیر مساجد اور قیام مدارس اور بیواؤں ومسکینوں کی مدد وغیرہ نہیں یہ کام تو کافر بھی کرتا ہے، دین کی نصرت دعوت الی اللہ اور خروج فی سبیل اللہ ہے، پھر فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ کی منمانی تفسیر کرتے ہوئے خروج اور نفر کو ہر ایک پر ضروری قرار دینا، اور وابتغوا من فضل اللہ کی مرجوح تفسیر کرنا، حیاء اور بے حیاء کی غلط تشریح کرنا وغیرہ وغیرہ، ایک دو نہیں اس نوع کی پچاسوں باتیں ہیں جن کو مولانا قوت سے بیان فرماتے ہیں اور وہ باتیں امت میں چل رہی ہیں، ہم تمام اہل حق علمائے محققین ومصلحین اور تمام اہل مدارس سے گزارش کرتے ہیں کہ اجتہاد واستنباط کے اس دروازہ کو بالکل بند کریں اور دین وشریعت اور مسلک جمہور اور پوری امت کی حفاظت کریں، اور جو غلط باتیں مولانا بیان کر چکے ہیں ان کے متعلق وہی طرز اختیار کریں جس کو مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم حضرت مولانا سید محمد سلمان صاحب اور دیگر اساتذہ نے اختیار کیا ہے، جزاہم اللہ خیر الجزاء، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے اور جمنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

خلاصۂ کلام

(ا) تعلیم وتدریس پر اجرت لینے کے متعلق مولانا محمد سعد صاحب جو باتیں بیان فرماتے ہیں، اور ان کے واسطہ سے دیگر تبلیغی حضرات اور ان کے معتقدین مزید حاشیہ کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، مثلاً یہ کہ:

(الف) تعلیم قرآن وتعلیم دین اور تدریس پر اجرت نہیں لینا چاہئے، اور اس لین دین کو اجرت زانیہ سے تشبیہ دیتے ہیں، اور دلیل میں حضرت عمرؓ کا یہ اثر پیش کرتے ہیں کہ بہت سے زنا کار اجرت لے کر تعلیم وتدریس کرنے والوں سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

(ب) اور مثلاً یہ کہ دینی تعلیم میں اجر واجرت دونوں جمع نہیں ہو سکتے یا تو اجر لے لو یا اجرت۔

(ج) اجرت لے کر تعلیم دینے والے کوئی دینی خدمت نہیں کر رہے، اصل دینی خدمت تو دعوت وخروج اور نفر ہے، جو بغیر کسی تنخواہ کے ہوتی ہے۔

(د) علمائے کرام کو اپنے اندر جامعیت پیدا کرنا چاہئے وہ یہ کہ تعلیم وتدریس اور دعوت کے ساتھ تجارت بھی کریں، جیسا کہ صحابہ کرام کرتے تھے، اپنے اندر جامعیت نہ پیدا کرنا یعنی تجارت نہ کرنا نکما پن ہے۔

(ہ) اور اپنے مذکورہ دعووں اور غلط باتوں کو ثابت کرنے کے لئے حضرت ابی ابن کعبؓ وغیرہ کی حدیثیں بیان کرنا وغیرہ وغیرہ۔

مولانا محمد سعد صاحب اور دیگر اصحاب تبلیغ نے یہ ساری باتیں، دعوے اور دلائل جس انداز سے پیش کی ہیں، وہ صحیح نہیں ہیں، جن کی تحقیق ماقبل میں کی جا چکی، ایسی باتوں سے اسلاف ومشائخ سے نیز موجودہ اکابر علماء واہل مدارس سے بدگمانی، بدزبانی اور استخفاف پیدا ہوتا ہے، اور خود ان کے اندر تکبر وتعلّی اور خود پسندی کی شان پیدا ہوتی ہے، اس لئے ایسی باتوں اور ایسے دلائل کو بیان کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

(۲) اس پورے مقالہ میں دلائل کی روشنی میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کے پیش نظر ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اجرت وتنخواہ کے ساتھ بھی دینی تعلیم وتدریس دین کی بڑی خدمت ہے جو نہ اجر وثواب کے منافی ہے اور نہ ہی تقویٰ وتدیّن کے خلاف ہے، اور تعلیم کے ساتھ تجارت نہ کرنے کو نکما پن کہنا نہایت نکمی بات ہے، اگر اس بات کو تسلیم کرلیا جائے تو ہمارے تمام اکابر واسلاف کا نکمّا پن ہونا سمجھا جائے گا۔

(۳) ہم اس بات پر مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی کا بہت شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے بھوپال کے اجتماع میں لاکھوں لوگوں کے سامنے سفر وحضر میں نیز مرکز نظام الدین کی چہار دیواری اور رکگریل کے مرکز میں اور اس کے علاوہ بھی تقریراً وتحریراً چھوٹے بڑے ہر طرح کے مجمع کے سامنے اپنے متعلق واضح طور پر بار بار یہ اعلان کیا اور اپنا مسلک بیان فرمایا کہ:

”ہمارا کوئی مذہب یا کوئی الگ طریقہ نہیں ہے، ہم اہل سنت والجماعت ہیں، دیوبند اور اہل دیوبند، ان کا مسلک ہی ہمارا مسلک ہے، دیوبند اور اہل دیوبند کا مسلک ہی ہمارا مسلک ہے، ذرہ برابر دین ودنیا کے کسی شعبہ میں اپنی رائے قائم کرنا اس کا کوئی تصور نہ کیا گیا ہے نہ کیا جاسکتا ہے“

نیز اپنے بعض رجوع ناموں میں مولانا سعد صاحب واضح طور پر تحریر فرماتے ہیں:

”احقر بغیر کسی تردد وتامل کے صاف لفظوں میں اپنا موقف واضح کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ احقر الحمدللہ اپنے تمام اکابر ومشائخ علماء دیوبند ومظاہر علوم سہارنپور کے موقف، اور اپنی جماعت کے اکابر حضرت مولانا محمد یوسف اور حضرت مولانا انعام الحسن کے مسلک ومشرب پر قائم ہے، اور اس سے ایک ذرہ انحراف کو بھی پسند نہیں کرتا، بندہ کو علماء دارالعلوم دیوبند پر مکمل اعتماد ہے“

(رجوع نامہ کی سب سے پہلی تحریر اور آخری تحریر، ماخوذ از سعادت نامہ ص ۱۱ و ۲۵)

نیز ایک موقع پر بیان فرمایا کہ:

”ہم کوئی مستقل جماعت نہیں اور ہمارا کوئی الگ مسلک نہیں، ہمارا کوئی علٰحدہ منشور نہیں، ہمارا مسلک ومشرب وہی ہے جو علماء دیوبند وسہارنپور کا ہے، درسِ تفسیر وغیرہ کے متعلق بس یہ دیکھ لو کہ وہ مسلک دیوبند سے منسلک اور وابستہ ہے یا نہیں“

علمائے دیوبند کو جو مسلک ہے وہی ہمارا مسلک ہے، تبلیغی کام کرنے والوں کا اپنی کوئی رائے قائم کرنا انتہائی گمراہی اور فتنہ کا سبب ہے، نئی بات دل سے نکال دینا کہ ہمارا ان مراکز کے علاوہ کوئی اور مرجع ہے، اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

بندہ محمد سعد بنگلہ والی مسجد نظام الدین

۲۹ ؍صفر المظفر ۱۴۳۸ھ مطابق ۳۰ ؍جنوری ۲۰۱۶ء بروز چہارشنبہ

(ماخوذ از سعادت نامہ ص ۱۳)

(۴) لیکن ان سب واضح اعلان واقرار کے بعد بھی مولانا محمد سعد صاحب کے بیان کردہ ان غلط مسائل ودلائل کی وجہ سے تمام علمائے محققین اور سمجھدار اصحابِ دعوت وتبلیغ نہایت فکرمند اور تشویش میں ہیں کہ لاکھوں کے مجمع میں مولانا کے یہ سارے اقرار واعلانات کیا جھوٹے تھے؟ یا مکر وفریب پر مشتمل محض لوگوں کو دکھلانے اور سنانے کے لئے تھے؟ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہ تھا، اگر ایسا نہیں تو پھر آخر مولانا کیوں مسلک جمہور اور اکابر علمائے دیوبند وسہارنپور کی تحقیقات وتصریحات اور ان کے جاری کردہ فتاویٰ کے خلاف آیتوں اور حدیثوں کی من مانی تفسیر وتشریح کرتے ہوئے غلط نتائج نکالتے ہیں، جبکہ اجتہاد واستنباط کا ان کا منصب بھی نہیں، وہ کیوں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کی اس ہدایت پر عمل نہیں کرتے کہ:

”اگر کسی مسئلہ اور حدیث کی تحقیق وتشریح میں علمائے محققین سے ہٹ کر ان کی ذاتی رائے ہے تو اپنی ذات تک ہی اس کو محدود رکھیں، اس کو بیان نہ کریں“

اکابر علمائے دیوبند وسہارنپور اور معتمد دارالافتاء کی تحقیقات وفتاویٰ کے خلاف مولانا جو مضامین بیان کرتے ہیں علمائے محققین امت

کے حق میں ان سب کو مضر سمجھتے ہیں، اور مولانا پر لازم اور ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنے سابقہ رجوع واقرار اور عہد کے مطابق اب تک جتنی غلط باتیں بیان کر چکے ہیں ان سب سے بھی رجوع فرمالیں، اور آئندہ بیان کرنے سے کلی اور قطعی طور پر احتراز کریں، نیز آئندہ کے لئے ایسے نئے نئے اجتہاد کا دروازہ بالکل بند کردیں، علمائے محققین اور مصلحین امت دین کی غلط ترجمانی احادیث کی منمانی تشریح، مسائل کی غلط توضیح اور انوکھے نئے نئے غلط استنباطات واجتہادات برداشت نہیں کرسکتے، وہ دین وشریعت کی اور امت کی حفاظت اور ان کو کج روی سے بچانے کو اپنے اوپر لازم اور ضروری سمجھتے ہیں۔

تمت

محمد زید مظاہری ندوی

استاذِ حدیث وفقہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

شوال ۱۴۳۸ھ